معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں ، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے ، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ــــــ رقم پیشگی آنی چاہیے ۔

جلد ۱۵۴ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۴ء عدد ۶

مضامین

شذرات

اس وقت ملک میں ہر سو وحشت، بربریت، قتل، خوں ریزی، تشدد، دہشت گردی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے، تعلیمی ادارے جو افراد سازی کے کارخانے تھے آج طلبہ کی شورش پسندی اور ہنگامہ آرائی اور اساتذہ کی غیر ذمہ داری اور اپنے فرائض سے عدم دلچسپی کی وجہ سے بدعنوانیوں کا مرکز بن گئے ہیں، جس طبقہ پر امن و امان قائم کرنے اور خرابیوں کی اصلاح کی ذمہ داری تھی وہی امن و عدل اور آئین و قانون کا شیرازہ درہم برہم کر رہا ہے، سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگ کھلم کھلا ہر قسم کی زیادتی اور سرکشی کے مرتکب ہوتے اور آئین شکنی کرتے ہیں مگر نہ حکومت کو انکے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ہمت ہوتی ہے اور نہ پولیس ان سے کوئی تعرض کرتی ہے، البتہ بے خطا، کمزور اور مظلوم لوگوں کو پریشان کرنا، ان کے خلاف فرضی اور جھوٹے مقدمے قائم کرنا، انہیں ہر قسم کی اذیت دینا اور زدو کوب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے۔

ملک کے اس بگڑے اور بدتر ماحول میں صرف مسلمانوں کے دینی عربی مدارس ہی کَاَنَّھَا مَنَارَۃُ مُمْسیٰ رَاھِبٍ مُتَبَتِّلٍ کے مصداق ہیں جن سے اسکی شب تاریک میں ضوفشانی ہو رہی ہے، یہ سب کے سب سیاسی ہنگاموں، قومی بکھیڑوں، ہر قسم کی شورشوں اور دہشت و تشدد سے الگ رہکر اپنی دھن میں مست اور اپنے حال میں مگن ہیں، انکا کام پیغام محبت پہنچانا ہے، یہ صرف قوم و ملک کی تعمیر و ترقی اور خلقِ خدا کی خدمت و نفع رسانی سے سروکار رکھتے ہیں، محبت، اخوت، میل ملاپ، صلح و آشتی اور رواداری کی دعوت دیتے ہیں، اپنے اور پرائے کی تمیز کے بغیر سب کی بھلائی اور خیر خواہی چاہتے ہیں، حق و صداقت کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں، ظلم و ناانصافی کی مذمت کرتے ہیں، لوگوں کو شر و فساد سے باز رکھتے ہیں اور انہیں عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کرتے ہیں، مسلمانوں کا ہر دینی مدرسہ اسی اصول پر کاربند ہے وہ جانتا ہے کہ جھگڑوں، تفرقوں اور نفرتوں سے ملک کمزور ہوگا، اسکی بھلائی میل ملاپ، دوستی اور بھائی چارگی میں پنہاں ہے۔

آسایشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ہندوستان کے دینی مدارس میں ندوۃ العلماء لکھنؤ بہت ممتاز ہے، اسکے اساتذہ و طلبہ خاموشی اور ذمہ داری سے علم، مذہب، قوم اور وطن کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اسکے ناظم اور سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان اور مسلمانوں کے ہر طبقہ کے معتمد ہیں، وہ اپنی حب الوطنی اور قوم و وطن کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی وجہ سے ہندوؤں کے حلقہ میں بھی مقبول ہیں، جس قدر ملک میں ان کی عزت و عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اس سے زیادہ عرب اور اسلامی ملکوں میں ان کا اعزاز و اکرام کیا جاتا ہے، ان کا آوازۂ شہرت عرب و عجم ہی میں نہیں یورپ، امریکہ اور افریقہ کے ملکوں میں بھی پہنچ گیا ہے، وہ ندوۃ العلماء کے علاوہ ہندوستان، اسلامی ملکوں اور یورپ کے متعدد علمی، تعلیمی، تحقیقی اور تصنیفی اداروں کے سربراہ ہیں جن میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی بھی ہے، ملک کو فتنہ و فساد، جنگ و جدال اور تباہی و بربادی کے دہانے پر دیکھ کر انکا درد مند دل تڑپ اٹھا اور وہ انسانیت کا پیغام پہنچانے کے لیے اسکے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئے۔

پورے ہندوستان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی کی ذات گرامی ہے جن کو اسلامی ملکوں کے علماء و فضلاء، اعیانِ حکومت اور فرمانروا اپنے یہاں مدعو کرتے اور ان سے مہمات امور میں رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں اور ان سے ملنے کے لیے لکھنؤ اور رائے بریلی تشریف لاتے ہیں، ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے سربراہ انکے پاس آنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، وزرائے اعظم مسز اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، وی۔ پی سنگھ اور اترپردیش کے وزرائے اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا، نرائن دت تیواری، ملائم سنگھ اور دوسرے متعدد مرکزی و صوبائی وزرا اور کئی ریاستوں کے گورنران کے بوریائے فقر پر فروکش ہوتے رہے ہیں اور ہم جیسے مسلمان انکی مجلسوں میں حاضر ہو کر اپنا ایمان و یقین تازہ کرتے ہیں تعال نومن ساعۃ۔ اگر انکی سربراہی میں چلنے والا دنیائے اسلام کا یہ مقبول

ادارہ ہی تشدد اور دہشت گردی کا اڈا بن جائے تو کجا ماند مسلمانی ؟

گذشتہ ماہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے بے گناہ طلبہ پر رات کے سناٹے میں پولیس نے گولیاں چلاکر انہیں زدوکوب کیا، گرفتار کیا اور ندوہ کی عمارتوں کو نقصان پہنچایا اس سے ہندوستان ہی نہیں دنیا کے مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا ہے دراصل حکومت اور اس کی انتظامیہ نے مسلمانوں کی تذلیل واہانت کا جو ناروا سلسلہ شروع کیا ہے یہ اسی کی ایک کڑی ہے ابھی تک مسلمان بابری مسجد کی شہادت سے کراہ ہی رہے تھے کہ اس دوسرے سنگین حادثہ نے انکو پھر نہایت بے قرار و بے چین کر دیا، وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ ان کے اتنے باوقار معتبر، صلح و آشتی، امن و امان اور انسانیت کے داعی و علمبردار ادارہ پر شب خون مارا جا سکتا ہے اگر حکومت اور انتظامیہ کو مولانا سید ابو الحسن علی کی حب الوطنی پر بھروسہ نہیں اور وہ ان کے ساتھ دوسرے اور تیسرے درجہ کے شہریوں جیسا برتاؤ کر سکتی ہے تو عام مسلمان کس شمار قطار میں ہیں، انہیں بڑی سنجیدگی اور دوراندیشی سے اپنے بارے میں سوچنا اور اپنی اصلاح و تنظیم کا پروگرام بنانا ہوگا۔ حکومت کے لاعلمی کا عذر کر دینے اور شرمندگی ظاہر کرنے یا معافی مانگ لینے سے مسلمانوں کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ انکی تسلی تو اس سے ہوگی کہ آئندہ اس طرح کے واقعات کا سد باب کرنے کے لیے ندوہ پر پولیس ایکشن کے ذمہ دار ہر ہر شخص کو عبرت ناک سزا دی جائے۔

حضرت پیر محمد شاہ درگاہ ٹرسٹ کی دعوت اور اپنے مخلص بزرگ جناب ضیاء الدین ڈیسائی کی خواہش پر راقم نے اس ماہ کے اوائل میں احمد آباد کا سفر کیا اور درگاہ ٹرسٹ کے سمینار میں شرکت کی، جس کی روداد آئندہ سپرد قلم ہوگی۔

خاکسار کے والد بزرگوار کی وفات کی خبر سنکر متعدد مخلصین نے تعزیتی خطوط لکھے اور تار بھیجے، ان سب کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

مقالات

مدینہ منورہ کی دینی و علمی و ادبی مجلسیں

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔

حضرات صحابہ و تابعین کی عام تعلیمی و تدریسی مجلسوں اور حلقوں کے علاوہ مختلف اوقات میں ان کی خصوصی مجلسیں اور حلقے بھی قائم ہوتے تھے، جن میں ہم ذوق اہل علم مختلف علوم وفنون اور حالات و معاملات پر بحث و مذاکرہ کرتے تھے اور اس کا محور دین ہوتا تھا، کتاب وسنت، فقہ و فتویٰ، سیر و مغازی، شعر و ادب اور ایام عرب ان کے خاص اور دلچسپ موضوعات تھے، مدینہ عجمی افکار و خیالات سے پاک تھا، کوفہ بصرہ کی طرح یہاں فکری وذہنی فتنے نہیں تھے، اہل مدینہ کا مزاج سراسر دینی و مذہبی تھا، اسی کے ساتھ ان میں شرعی حدود کے اندر جمالیاتی ذوق، تفنن طبع، زندگی اور زندہ دلی پائی جاتی تھی، اسلئے ان کی یہ مجلسیں بڑی نظیف و لطیف، بابرکت اور دلکش ہوتی تھیں، رفاہیت اور خوشحالی کا دور شروع ہو چکا تھا، بڑی حد تک زندگی کا معیار بلند ہوگیا تھا، ارباب جاہ وحشم کی داد و دہش، سخاوت، مروت اور فتوت کی وجہ سے ذہنی و طبعی سکون تھا اور ہر موضوع پر کھل کر بات چیت ہوتی تھی۔

یہ مجلسیں عام طور سے مسجد نبوی کے مختلف حصوں میں مختلف اوقات میں منعقد ہوتی تھیں، اس کے علاوہ مدینہ کے عوالی واطراف میں بھی ان کا انعقاد ہوتا تھا، خاص طور سے وادی عقیق کے قصور و محلات میں علمی و ادبی مجلسیں کئی کئی دن تک جمی رہتی تھیں،

یہاں کے حسین وجمیل قدرتی مناظر شعراء ادباء اور اہل ذوق کے لیے جاذب قلب ونظر تھے۔ اس فرحت افزا اور صحت بخش دلکش علاقہ میں سیر وتفریح، دعوت ومدارات اور مجلسی بحث ومذاکرہ میں خوش وقت کرتے تھے۔

اس وقت تک امالی، مجالس، نوادر اور تعلیقات کے جمع وترتیب کا رواج نہیں ہوا تھا، اس لیے مدینہ اور وادئ عقیق وغیرہ کی مجالس کے دینی، علمی، ادبی، لسانی، شعری شہ پارے کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں، زبیر بن بکار کی کتاب نوادر المدنیین اور کتاب العقیق واخبارہا اور ابو علی ہارون بن زکریا ہجری کی کتاب العقیق واخبارہا اور کتاب النوادر والتعلیقات (معلوم ہوا ہے کہ چھپ گئی ہے) میں ان مجلسوں کے نوادر درج رہے ہوں گے مگر یہ کتابیں ناپید ہیں، ابو الفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی اور ابو علی قالی کی کتاب الامالی وغیرہ میں مدینہ کے شعراء وادباء کے کچھ نوادر ملتے ہیں، ذیل میں مدینہ منورہ اور وادئ عقیق کی چند مجلسوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مجلس القلادہ

عہد صحابہ وتابعین میں مدینہ منورہ میں علمی ودینی مجلسیں منعقد ہوتی تھی، جن میں مختلف موضوعات پر کھل کر گفتگو ہوتی تھی اور ان میں شریک ہونے والے علماء، فقہاء، محدثین اور اعیان واشراف اظہار رائے کرتے تھے، بعض اوقات مسائل حاضرہ اور وقتی سیاست پر بھی بحث ہوتی تھی، یہ مجلسیں مسجد نبوی کے مختلف حصوں اور گوشوں میں عام طور سے رات میں نماز عشاء کے بعد منعقد ہوتی تھیں، ان کے علاوہ شہر کے مختلف مقامات پر ہم ذوق اہل علم وادب کی مستقل نشست ہوتی تھی، جس میں حدیث، تفسیر، فقہ، مغازی، شعر وادب پر مذاکرہ ہوتا تھا۔

ان ہی مجلسوں میں ایک مجلس القلادہ تھی جو مسجد نبوی کے اسطوانۂ وفود کے پاس ہر رات عشاء کے بعد جمتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف قبائل کے وفود آتے تو آپ اسی ستون کے پاس ان کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے، یہ حجرۂ مبارکہ سے متصل ستون محرس کے بعد دوسرا ستون ہے، اسی کے پاس مجلس القلادہ منعقد ہوتی تھی۔

مدینہ منورہ کے ہر مورخ نے اس مجلس کا شاندار طریقہ پر ذکر کیا ہے، قدیم ترین مورخ محمد بن حسن بن زبالہ مخزومی مدنی نے سنہ ۱۹۹ھ میں تاریخ المدینہ تصنیف کی، اس میں لکھا کہ:

وانه المجلس الذی یقال	اسی مجلس کو مجلس القلادہ کہا جاتا تھا
له مجلس القلادة وكان	پہلے زمانہ میں اس میں نامی گرامی
یجلس فیه سروات الناس	حضرات بیٹھا کرتے تھے۔
قدیما۔	

علامہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں بیان کیا ہے:

وكانت تعرف ایضا بمجلس القلادة	یہ مجلس القلادہ کے نام سے مشہور تھی
ومجلس الیهاسر وات الصحابة	اس میں طبقۂ صحابہ کے علماء وفضلاء
وافاضلهم رضوان الله علیهم۔	اور سربرآوردہ حضرات شریک ہوتے تھے۔

اور صاحب قاموس علامہ مجد الدین نے المغانم المطابہ میں لکھا ہے:

وانما سمی القلادة لشرف	اس میں بنو ہاشم وغیرہ کے اعیان و
من كان یجلس الیها من بنی	اشراف کے شریک ہونے کی وجہ سے

ھاشم وغیرھم[1] اسکو قلادہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اس میں اجلہ صحابہ وتابعین، قریش کے اعیان واشراف، انصار اور مہاجرین کے سربرآوردہ حضرات پابندی سے شریک ہوتے تھے اور مدینہ منورہ کے دینی وعلمی یواقیت وجواہر کا یہ حلقہ اس کے گلے کا ہار تھا، محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المنمق میں اسکو یوں بیان کیاہے:

وکان ذلک المجلس تسمی مجلس	یہ مجلس اپنے حسن وجمال اور اہل عزو
القلادۃ یشبہ بالقلادۃ المنظمۃ	شرف شرکاء کی وجہ سے موتیوں سے
بالجوھر لحسنہ وجمالہ وشرف	گندھے ہوئے ہار کے مانند تھی اسی لیے
اھلہ[2]	اس کا نام مجلس القلادہ پڑ گیا۔

اس کے شرکاء میں چند حضرات کے نام یہ ہیں (۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۲) حضرت حسن بن علیؓ (۳) حضرت عبیداللہ بن عدی بن خیار (۴) عبدالرحمن بن عبداللہ بن ابوربیعہ مخزومی (۵) حضرت ابویسار بن عبدالرحمن بن عبیداللہ (۶) حضرت موسیٰ بن طلحہ بن عبیداللہ (۷) حضرت عبدالرحمن بن عبد قاری رضی اللہ عنہم، ان کے علاوہ بنو ہاشم، بنوامیہ، انصار، مہاجرین وغیرہ کے اہل علم وفضل اور اعیان واشراف ہر رات اس میں پابندی سے شریک ہوکر مختلف امور ومسائل پر بحث ومذاکرہ کیا کرتے تھے، مذکورہ بالا شرکائے مجلس کے ناموں سے اس کی عظمت واہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ قیام مدینہ کے زمانہ میں پابندی سے اس میں شریک ہوتے تھے اور اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے، ملک شام جانے کے بعد بھی اس مجلس کی یاد

[1] وفاالوفا، ج ۱، ص ۴۴۹ - ۴۵۰۔ [2] کتاب المنمق، ص ۴۴۵۔

ان کو ستاتی تھی اور جب کوئی شخص مدینہ سے ان کے پاس جاتا تو اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور کہتے تھے کہ:

لن تبرح المدینۃ عامرۃ	جب تک مجلس قلادہ برپا رہے گی،
ما دام مجلس القلادۃ۔	مدینہ آباد رہے گا۔

اس مجلس کے علمی، دینی، ادبی شہ پارے اور نوادرات یکجا نہیں ملتے ہیں، صرف محمد بن حبیب بغدادی متوفی ۲۴۵ھ نے دو واقعات بیان کئے ہیں، جو اس کے شیعی رجحان سے تعلق رکھتے ہیں، ہم ان کو بیان کرتے ہیں۔

اس مجلس کے حاضر باش لوگوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ایک بزرگ محمد بن عبداللہ بن ابوعتیق محمد بن عبدالرحمن بن ابوبکر صدیق بھی تھے جو ابن ابوعتیق کی کنیت سے مشہور تھے، ان کے ذمہ ایک تاجر کا چھ ہزار درہم قرضہ تھا تاجر نے تقاضا کیا تو ابن ابوعتیق نے اس سے کہا کہ فی الحال قرضہ کی ادائیگی کا انتظام نہیں ہے، البتہ تم کو ایک ترکیب بتاتا ہوں جس سے میں قرضہ سے سبکدوش ہوسکتا ہوں میں جب مجلس قلادہ میں جاکر بیٹھوں تو تم میرے پاس آکر مجھ سے بنی عبد مناف والوں کے بارے میں سوال کرنا۔

اس گفتگو کے بعد ابن ابوعتیق رات کو مجلس قلادہ میں جاکر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ گئے، وہ تاجر بھی طے شدہ بات کے مطابق وہاں آکر بیٹھ گیا اور ابن ابوعتیق سے کہا کہ ابومحمد! آپ مجھے خاندان بنو عبدمناف کے بارے میں کچھ باتیں بتایئے، انھوں نے بتایا کہ بنو عبدمناف کی شاخ آل حرب نے شرک کیا تو دوسرے لوگوں نے

بھی شرک کیا اور جب آل حرب نے اسلام قبول کیا تو دوسرے لوگ بھی مسلمان ہوگئے، تاجر نے پوچھا کہ اس کے بعد اس خاندان کے دیگر افراد کیسے ہیں؟ ابن ابوعتیق نے کہا کہ بنوعاص میں شہداء اور اشراف سب سے زیادہ ہیں، تاجر نے یہ سن کر کہا کہ سبحان اللہ، اس صورت میں آپ بنوعبدالمطلب کو کس درجہ پر رکھیں گے، ابن ابوعتیق نے غصہ کے انداز میں تاجر سے کہا:

یا احمق انما سألتنی عن بیوت	ارے احمق! تو نے آدمیوں کے گھرانے
الآدمیین ولو سألتنی عن وجوہ	کے متعلق پوچھا تھا، اگر معزز و مقرب
الملائکة لاخبرتك عن بنی	ملائکہ کے متعلق مجھ سے دریافت کرتا تو
عبد المطلب فیھم رسول اللہ	میں تم کو خاندان عبدالمطلب کے بارے
صلی اللہ علیہ وسلم وفیھم	میں بتاتا کہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ
اسد اللہ وفیھم الطیار	علیہ وسلم اور حضرت حمزہ اسد اللہ اور
فی الجنة۔	جعفر طیار ہیں۔

حضرت حسنؓ نے ابن ابوعتیق کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی کہا کہ ابومحمد! میں تم سے قسم دے کر کہتا ہوں کہ کوئی حاجت ہو تو مجھ سے بیان کرو، ابن ابوعتیق نے کہا کہ ہاں اس شخص کا چھ ہزار درہم میرے ذمہ باقی ہے، حضرت حسنؓ نے کہا:

قد قضاھا اللہ عنك ھی	اللہ تعالیٰ نے یہ قرض تمہاری طرف
علینا دونك۔	سے ادا کر دیا، وہ ہمارے ذمہ ہے،

حسب معمول ایک رات یاران باصفا مجلس قلادہ میں مختلف موضوعات پر باتیں کر رہے تھے، اسی درمیان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ

ہونے لگا اور عبیداللہ بن عدی بن خیار نے کہا کہ بلاغت و تفقہ میں حضرت علیؓ جیسا میں نے کسی کو نہیں دیکھا، یہ سن کر ابویسار بن عبدالرحمن نے ان سے کہا کہ گویا آپ نے حضرت معاویہؓ کو نہیں دیکھا ہے، خدا کی قسم معاویہ کی ذات اور قلب کو انسان ہی پہچان سکتا ہے، مجلس میں عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر بھی موجود تھے، انہوں نے ابویسار سے کہا کہ گویا آپ نے حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف اور کمالات کو نہیں دیکھا، عبدالرحمن بن عبداللہ ابوربیعہ نے ان باتوں کو سن کر کہا کہ آپ لوگ صرف مہاجرین میں فضیلت دیکھ رہے ہیں، ان میں اسلام لانے کے علاوہ اور کون سی خاص بات ہے؟ کیا آپ لوگوں نے حارث بن ہشام کو نہیں دیکھا ہے؟ اس پر موسیٰ بن طلحہ نے کہا کہ اس مجلس میں آپ حارث بن ہشام وغیرہ کا ذکر مہاجرین کے ساتھ کر رہے ہیں، حالانکہ وہ مہاجرین کے غلام تھے جنہوں نے ان کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد آزاد کر دیا۔

اس بحث و تکرار نے اتنا طول پکڑا کہ عبدالرحمن اور موسیٰ آپس میں الجھ پڑے، اور حاضرین نے بیچ بچاؤ کر کے اس وقت معاملہ رفع دفع کر دیا، مگر عبدالرحمن نے کہا کہ میں اس بات کو امیر مدینہ مروان بن حکم سے بیان کر کے کہوں گا کہ موسیٰ نے آپ کو اور معاویہ کو غلام بتایا ہے، یہ سن کر موسیٰ کو مروان کی سخت گیری سے خطرہ محسوس ہوا اور اسی وقت مجلس سے اٹھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہونچے، وہ موسیٰ کی رضاعی خالہ تھیں، خادمہ بریرہ نے دروازہ کھولا، معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ سو گئی ہیں اور موسیٰ کچھ کہے سنے بغیر واپس چلے گئے۔

ادھر عبدالرحمن نے رات ہی میں مروان کو سارا واقعہ سنا دیا تھا، مروان صبح کی نماز کے بعد منبر پر بیٹھا اور کہا کہ وہ شخص کہاں ہے جو کہتا ہے کہ امیر المومنین آزاد کردہ

غلام ہیں، اس کے بعد طرح طرح کی دھمکی دی، حضرت عائشہؓ حجرہ کے اندر مصلی پر بیٹھی مروان کی باتیں سُن رہی تھیں، انکا معمول تھا کہ طلوع آفتاب سے پہلے کسی سے بات چیت نہیں کرتی تھیں، دن نکلنے کے بعد بریرہ سے پوچھا کہ کیا بات ہے، مروان کیا کہہ رہا ہے؟ موسیٰ وہیں موجود تھے، فوراً سامنے جاکر بتایا کہ مروان مجھ کو یہ سب باتیں سُنا رہا ہے، پھر رات کی مجلس کا پورا واقعہ بیان کیا، حضرت عائشہؓ نے تمام ماجرا سُنکر فرمایا کہ افسوس مروان اس حقیقت کا انکار کر رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و کرم نے فتح مکہ کے موقع پر ان لوگوں کو اپنی پناہ میں لینے کے بعد ان کی جان ان ہی کو ہبہ کر دی، اسوقت حضرت عائشہؓ کی آواز کچھ تیز ہوگئی تھی۔

اس کے بعد موسیٰ سے کہا کہ تم اپنے مکان چلے جاؤ، موسیٰ نے کہا کہ مروان کی طرف سے مجھے خطرہ ہے، حضرت عائشہؓ نے کہا کہ کیا مروان میں اتنی ہمت ہے کہ تم کو تکلیف پہونچا سکے، یہ سُنکر موسیٰ اپنے گھر چلے گئے۔

اس کے بعد مروان نے حضرت عائشہؓ کی تمام باتیں حضرت معاویہؓ کے پاس لکھیں، حضرت معاویہؓ نے مروان کا خط پڑھ کر کہا کہ:

فسد واللہ مجلس القلادۃ	واللہ مجلس قلادہ اجڑ گئی، تف ہے
لعن اللہ مروان	مروان پر،

اور مروان کو لکھا کہ تم پر، تمہارے خطبہ پر اور منبر رسول پر بیٹھنے پر تف ہے، اس خط کے بعد اس معاملہ میں کوئی گفتگو نہ کرنا اور نہ ہی کسی قسم کی کارروائی کرنا، اس واقعہ کی رات میں لوگ مجلس قلادہ سے نکلے تو اس میں نہیں گئے اور مجلس ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔[1]

[1] کتاب المنمق، ص ۴۴۵ تا ۴۴۹، حیدرآباد۔

محمد بن حبیب کے بیان کردہ پہلے واقعہ میں حضرت حسنؓ کے جود و سخا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد پر ان کے احسان و ترحم کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے واقعہ سے حضرت معاویہؓ اور بنوامیہ کی تحقیر معلوم ہوتی ہے، اس میں خاص ذہنیت کام کرتی ہے۔

مجلس فقہائے سبعہ

مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ کی المجلس الفقہی مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی، یہ مجلس ان حضرات کی تدریسی و تعلیمی مجلسوں کے علاوہ حوادث و نوازل میں بحث و مذاکرہ اور غور و فکر کے لیے منعقد ہوتی تھی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا فقہی مسلک ان کے تلامذہ نے مدینہ میں عام کیا جن میں فقہائے سبعہ (سات فقہاء) خاص شہرت کے مالک ہیں، ایک شاعر نے کہا ہے:

اذا قیل من فی العلم سبعۃ ابحر	روایتھم لیست عن العلم خارجہ
فقل ھم عبید اللہ عروۃ قاسم	سعید ابوبکر سلیمان خارجہ

یعنی عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود متوفی ۹۸ھ عروہ بن زبیر بن عوام متوفی ۹۴ھ قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق متوفی ۱۰۷ھ سعید بن مسیب متوفی ۹۴ھ ابوبکر بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام متوفی ۹۴ھ سلیمان بن یسار ہلالی متوفی ۱۰۷ھ خارجہ بن زید بن ثابت متوفی ۱۰۰ھ، ابن رشیق قیروانی نے العمدہ فی محاسن الشعر و نقدہ میں فقہاء کے اشعار نقل کیے ہیں، اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ قبیلہ ہذیل کی ایک حسین و جمیل عورت مدینہ آئی اور جمالیات پسند ارباب ذوق اس کو شادی کا پیغام دینے لگے، فقہائے سبعہ میں سے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود نے ازراہ تفنن و زندہ دلی اس عورت کے بارے میں یہ اشعار کہے اور المجلس الفقہی

کے ارکان کے نام ان میں جمع کیے۔

احبک حباً لو علمت ببعضه — لجدت ولم یصعب علیک شدید

وحسبک یا ام الولید مولهی — شهیدی ابوبکر فنعم شهید

ولعلم وجدی قاسم بن محمد — وعروة ما اخفی بکم وسعید

ولعلم ما القی سلیمان علمه — وخارجة یبدی بنا ولعید

حتی تسائلی عما اقول تخبری — فللّٰه عندی طارق وتلید

اس کے بعد ابن رشیق نے ان چھ حضرات کے تفصیلی نام درج کر کے لکھا ہے کہ ساتویں یہی شاعر عبید اللہ بن عبد اللہ ہیں۔ یہی حضرات فقہائے مدینہ ہیں[1]

بعض اہل علم نے سالم بن عبد اللہ بن عمر کو ان میں شمار کیا ہے، یہ مجلس مسجد نبویؐ میں خاص خاص مسائل کے بارے میں منعقد ہوتی تھی اور ان میں کتاب و سنت، تعامل صحابہ اور سنت ماضیہ کی روشنی میں غور کر کے متفقہ فتویٰ دیا جاتا تھا، اسکے بعد اسی کے مطابق مدینہ کے قاضی فیصلہ صادر کرتے تھے، حضرت عبد اللہ بن مبارک کا بیان ہے:

کان فقهاء المدینة سبعة — فقہائے مدینہ سات تھے ان حضرات

وکانوا اذا جاءتهم — کے پاس جب کوئی مسئلہ آتا تو سب

المسئلة دخلوا فیها جمیعا — جمع ہو کر اس کے بارے میں غور

فنظروا فیها ولا یقضی القاضی — و فکر کرتے اور قاضی کوئی فیصلہ

حتی یرجع الیهم فینظرون — نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ انکی

[1] العمدہ ج ۱ ص ۲۵ و ۲۶۔

فیها فیصدرون[2] — طرف رجوع کرتا تھا اور وہ حضرات اس میں غور کر کے فیصلہ و فتویٰ صادر کرتے تھے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا یہ فقہی مجلس عام طور سے مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور بعض اوقات حسب ضرورت دوسرے مقامات پر بھی اس کا انعقاد ہوتا تھا، یہ اجتہاد و اجماع کی ابتدائی شکل تھی۔

مجلس اصحاب شوریٰ

فقہائے سبعہ اور مدینہ کے دوسرے علماء و فقہا اور اہل الرائے حضرات حکومت و امارت کے معاملات بھی طے کرتے تھے اور امراء و اعیان حکومت کے یہاں ان کی مجلس مشاورت منعقد ہوتی تھی، جس کی حیثیت مجلس شوریٰ کی تھی،

حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ ولید بن عبد الملک کی طرف سے مدینہ منورہ کے امیر بنائے گئے تو یہاں آتے ہی مسجد نبویؐ میں نماز ظہر کے بعد شہر کے ان دس فقہاء و علماء کو جمع کیا، عروہ بن زبیر، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعودؓ ابوبکر بن عبد الرحمن بن حارثؓ ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہ سلیمان بن یسارؓ قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق، سالم بن عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ، خارجہ بن زید بن ثابت رحمۃ اللہ علیہم۔

اور ان حضرات کے سامنے حمد و صلوٰۃ کے بعد مختصر سا خطبہ دیکر ان سے کہا:

انی دعوتکم لامر توجرون علیه — میں نے آپ لوگوں کو ایسے امر کیلیے

وتکونون فیه اعواناً علی الحق — دعوت دی ہے جس میں آپ کرلیے

[1] تہذیب التہذیب ج ۳، ص ۴۳۶، و سیر اعلام النبلاء ذکر سالم بن عبد اللہ۔

ما اريد ان اقطع امرا الا	اجر و ثواب ہے اور آپ حق کے
برائکم او برای من حضر منکم	اعوان و انصار ہوں گے، میں نہیں
فان رایتم احدا یتعدی	چاہتا کہ آپ سب کی رائے یا آپ
او بلغکم عن عامل لی ظلامة	میں سے جو حاضر ہو اس کی رائے
فاحرج باللہ علی احد	کے بغیر کسی بات کا قطعی فیصلہ کروں
بلغه ذلك الا بلغنی فجزوه	اگر آپ کسی کو حدود شرع سے گزرتے
خیرا وافترقوا۔[1]	ہوئے دیکھیں، یا میرے کسی عامل کی
	طرف سے ظلم و زیادتی کی خبر پہنچے تو
	میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ جسکو
	اس کی اطلاع ہو مجھے خبر کر دے،
	یہ سُن کر تمام حضرات نے جزاک اللہ، کہا۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے، ابو حنیفہ دینوری نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے دس فضلاء کو بلایا اور ان حضرات میں سے عروہ بن زبیرؓ عبد اللہ بن عتبہؒ ابو بکر بن عبد الرحمٰن بن حارثؒ ابو بکر بن سلیمان بن ابو حثمہ، سلیمان بن یسارؒ قاسم بن محمد بن ابو بکرؒ، سالم بن عبد اللہؒ کے نام درج کیے ہیں، جب یہ حضرات جمع ہو گئے تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ان سے فرمایا:

اعلموا انی لست اقطع امرا	آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہئیے کہ
الا برائکم و مشورتکم	میں آپ کی رائے مشورہ کے بغیر

[1] طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۳۴۴۔

فاشیروا علی۔	کسی بات کا قطعی حکم نہیں کر سکتا اس لیے مجھے مشورہ دیتے رہیں۔

اس پر ان حضرات نے کہا:

نفعل ایها الامیر جزیت علی	اے امیر! ہم ایسا ہی کریں گے،
ما تنوی خیر ما جزی مؤتمر	اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا دے
لمرضاة ربه ثم خرجوا۔[1]	یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ۸۶ھ کے آخر یا ۸۷ھ کی ابتداء میں امیر مدینہ بنکر آئے اور ۹۳ھ تک اس عہدہ پر رہے، اس سات سالہ مدت میں ان کے ہر قسم کے امور و معاملات فقہائے مدینہ کے مشورہ اور صوابدید سے انجام پاتے رہے، ایک مثال ملاحظہ ہو۔

۹۱ھ میں خلیفہ ولید کے حکم سے عمر بن عبد العزیزؒ نے مسجد نبویؐ کی تعمیر و توسیع کی، اس سے پہلے حضرت عثمانؓ کی توسیع میں مسجد کے حدود مشتبہ ہو گئے تھے، اس لیے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے قاسم بن محمدؒ سالم بن عبد اللہؒ نافع بن جبیرؒ عبید اللہ بن عبد اللہؒ، عبد اللہ بن عامر بن ربیعہؒ خارجہ بن زید بن ثابتؒ کو بلایا اور ان لوگوں نے عہد رسالت کی مسجد کی حد بتائی تو اسی کے مطابق تعمیر کا نقشہ بنوایا۔[2]

مجلس علمائے مغازی اس دور میں مدینہ منورہ میں مختلف علم و فن کے ممتاز علماء و فضلاء اپنے ذوق کے مطابق مذاکرات کی مجلسیں منعقد کرتے تھے اور خاص خاص موضوعات پر مذاکرہ و مباحثہ کر کے معلومات بہم پہنچاتے تھے، تفسیر حدیث فقہ و فتویٰ

[1] الاخبار الطوال ص ۳۱۳ [2] کتاب المناسک حربی، ص ۳۴۶۔

سیر و مغازی، ایام و حروب اور شعر و ادب اس دور کے عام موضوع تھے، چنانچہ سیر و مغازی کی علٰحدہ مجلس قائم ہوتی تھی جس میں غزوات و سرایا کے علماء و مصنفین شریک ہوتے تھے، مغازی کے مشہور مصنف ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی متوفی سنہ ۱۷۰ھ نے علمائے مغازی کی اس مجلس میں بیٹھ کر اس فن میں امامت کا درجہ پایا۔

ان کے صاحبزادے محمد بن ابو معشر سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے والد نے مغازی کو کیسے یاد کیا؟ انھوں نے بتایا کہ:

کان التابعون یجلسون الی	تابعین حضرات ان کے استاد کے یہاں
استاذہ فکانوا یتذاکرون	بیٹھ کر مغازی کے بارے میں مذاکرہ
المغازی فحفظ [1]	کرتے تھے، اسی مجلس میں ابو معشر
	نے مغازی یاد کی۔

اس دور میں مدینہ منورہ میں علم المغازی کے علماء و مصنفین کی ایک بڑی جماعت تھی، جس میں یہ حضرات نمایاں ہیں، عروہ بن زبیر متوفی سنہ ۹۴ھ، ابان بن عثمان بن عفان متوفی سنہ ۱۰۵ھ، عاصم بن عمرو بن قتادہ متوفی سنہ ۱۲۰ھ، شرحبیل بن سعد متوفی سنہ ۱۲۳ھ، محمد ابن شہاب زہری متوفی سنہ ۱۲۳ھ، عبداللہ بن ابو بکر بن حزم متوفی سنہ ۱۳۵ھ، ولید بن کثیر متوفی سنہ ۱۵۱ھ، موسیٰ بن عقبہ متوفی سنہ ۱۴۱ھ، عبداللہ بن جعفر متوفی سنہ ۱۷۰ھ، محمد بن اسحاق متوفی سنہ ۱۵۱ھ، یہ حضرات مغازی کی علٰحدہ مجلس منعقد کر کے باہمی افادہ و استفادہ کرتے تھے اور شرکاء و سامعین اس سے مستفید ہوتے تھے، ان ہی میں امام ابو معشر سندی بھی ہیں۔

[1] تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۴۲۸۔

مجلس عقیل بن ابو طالب

حضرت علیؓ کے بھائی حضرت عقیل بن ابو طالبؓ انساب اور ایام عرب کے زبردست عالم تھے، خاص طور سے قبیلہ قریش کے مثالب و معائب کے بارے میں ان کو بہت زیادہ معلومات تھیں، مسجد نبویؐ میں ان کی مجلس بڑے اہتمام سے منعقد ہوتی تھی، خاص طور سے ان کے لیے تکیہ رکھا جاتا تھا اور لوگ ان کے پاس بیٹھ کر انساب و حروب اور دوسری معلومات حاصل کرتے تھے۔

قریش میں چار ایسے مستند و معتبر اہل علم تھے کہ لڑائی جھگڑے میں انکا فیصلہ مانا جاتا تھا، عقیل، مخرمہ، حویطب اور ابو جہم، عقیل قریش کے معائب اور انکی غلط کاریوں کے واقعات بیان کرتے تھے اور باقی تین حضرات قریش کے محاسن اور کارناموں کو سناتے تھے۔ [1] حضرت عقیل کی شاندار مجلس کا ذکر اسد الغابہ میں یوں ہے:

وکان اعلم قریش بالنسب واعلمهم	وہ قریش کے انساب و حروب کے
بایامها... وکانت له طنفسة	سب سے بڑے عالم تھے۔ مسجد نبوی
تطرح له فی مسجد رسول الله	میں ان کے لیے تکیہ رکھا جاتا تھا اور
صلی الله علیه وسلم و یجتمع الناس	لوگ نسب اور ایام عرب کی معلومات
الیه فی علم النسب وایام العرب	کے لیے ان کے پاس جمع ہوتے تھے
وکان یکثر مثالب قریش فعادوه	وہ قریش کے معائب زیادہ بیان
لذلک وقالوا فیه بالباطل [2]	کرتے تھے، اس لیے لوگ ان کے
	مخالف ہو کر ان کے بارے میں غلط
	باتیں کہنے لگے۔

[1] اصابہ، ج ۴، ص ۲۵۵ [2] اسد الغابہ، ج ۳، ص ۴۲۳۔

حضرت عقیل اپنی مجلس میں ہر سوال کا فوراً مسکت جواب دیتے تھے، اصابہ میں ہے:

وکان عالماً بانساب قریش و مآثرها ومثالبها وکان الناس یاخذون ذلک عنه بمسجد المدینة وکان سریع الجواب المسکت۔

وہ قریش کے انساب، کارنامے اور معائب کے بڑے عالم تھے، مسجد نبوی میں لوگ ان باتوں کی معلومات حاصل کرتے تھے، وہ فوراً مسکت جواب دیا کرتے تھے۔

حضرت عقیل ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق گئے تو حضرت معاویہؓ نے کہا کہ عقیل نے علیؓ کے مقابلہ میں مجھ کو بہتر جانا اس لیے میرے پاس آئے ہیں، حضرت عقیل نے جواب دیا کہ علی دینی لحاظ سے بہتر ہیں اور آپ دنیاوی اعتبار سے بہتر ہیں۔

مجلس زین العابدین و عروہ

حضرت زین العابدین علی بن حسین، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت عبداللہ بن علی کی مجلس ہر رات عشاء کے بعد مسجد نبوی کے آخری گوشہ میں منعقد ہوتی تھی، جس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی، بعض اوقات وقتی سیاست اور اموی خلفاء و امراء کے بارے میں تبادلۂ خیالات بھی ہوتا تھا، حضرت حسن کے صاحبزادے کا بیان ہے:

کان علی بن حسین بن علی بن ابی طالب یجلس کل لیلة هو وعروة بن الزبیر فی مؤخر مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد العشاء الآخرة فکنت اجلس معهما۔

علی بن حسین اور عروہ بن زبیر ہر رات نماز عشاء کے بعد مسجد نبوی کے آخری حصہ میں بیٹھا کرتے تھے اور میں بھی ان دونوں حضرات کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔

اس کے بعد بیان کرتے ہیں کہ حسب معمول ایک رات ہم لوگ آپس میں گفتگو کر رہے تھے، باتوں باتوں میں بنی امیہ کے ظلم و جور کی بات چل پڑی اور یہ کہ جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ حالات میں تبدیلی کی طاقت نہیں رکھتے ہیں ایسے لوگوں کے متعلق علی بن حسین اور عروہ بن زبیر کو عذاب الٰہی کا خطرہ محسوس ہوا اور عروہ بن زبیر نے علی بن حسین سے کہا کہ اگر کوئی شخص بنو امیہ اور ان کے اعوان و انصار سے میل بھر دور رہے گا اور ان پر آفت آئی تو وہ محفوظ رہے گا، اس گفتگو کے بعد عروہ بن زبیر وادی عقیق میں اپنے قصر عروہ میں رہنے لگے اور میں مقام سویقہ میں منتقل ہو گیا۔[1]

مجلس زبان و ادب

مسجد نبوی میں زبان و ادب کی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں اور شعراء، ادباء، فصحاء و بلغاء کے کلام سے ارباب ذوق محظوظ ہوتے تھے، اس بارے میں آل زبیر مشہور تھے، ان میں حضرت ثابت بن عبداللہ بن زبیر سخاوت، شجاعت، خطابت، فصاحت اور بلاغت میں گویا قریش کے ترجمان تھے اور مسجد نبوی میں بیٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے تھے، اہل مدینہ خاص طور سے انکی مجلس میں انکا کلام سننے کے لیے آتے تھے، مسور بن عبدالملک کا بیان ہے:

کنا نأتی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما نزعنا الیه الا استماع کلام ثابت بن عبداللہ بن الزبیر بالفاظه۔[2]

ہم لوگ مسجد نبوی میں حاضر ہوتے تھے، صرف ثابت بن عبداللہ کے کلمات و الفاظ سننے کی کشش ہم کو وہاں لیجاتی تھی۔

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا کلام اور انداز گفتگو کس قدر پرکشش

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۱۸۱ [2] جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا، ص ۸۹۔

ہوتا تھا اور ان کو سننے کے لیے اہل ذوق کس طرح کھنچ کھنچ کر ان کے پاس آتے تھے۔

اسی طرح ان کے پوتے حضرت عبداللہ بن مصعب بن ثابت اپنے زمانہ میں مدینہ میں قریش کے مشہور خطیب اور زبان آور تھے اور جود و سخا، خوش خلقی کے ساتھ ظاہری حسن و جمال میں مشہور تھے، قدر و منزلت کے اونچے مقام پر فائز تھے، فصاحت و بلاغت میں اپنے دادا کی یاد تازہ کرتے تھے، ان کی مجلس بھی مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور لوگ ان کے فصیح و بلیغ کلام سننے کے لیے دور دور سے آکر لطف اندوز ہوتے تھے، عبدالرحمٰن بن مغیرہ حزامی کہتے ہیں:

کنا ناتی مسجد رسول اللہ صلی اللہ	ہم لوگ مسجد نبوی میں جاکر بیٹھا کرتے تھے
علیہ وسلم فنجلس فیہ ما نزعنا	صرف عبداللہ بن مصعب کے کلمات و
الی الجلوس فیہ الا استماع کلام	الفاظ سننے کی کشش ہم کو وہاں لیجاتی تھی۔
عبد اللہ بن مصعب والفاظہ۔[1]	

عبداللہ بن مصعب بن ثابت کے پوتے زبیر بن بکار بھی آل زبیر کے نامور شخص تھے، تاریخ انساب، ایام اور اخبار و آثار کے عالم اور حدیث و فقہ میں امام تھے، ان کی کتاب جمہرۃ نسب قریش واخبارہا کا معتد بہ حصہ چھپ چکا ہے، وہ بھی اپنے دادا اور خاندان والوں کی طرح مسجد نبوی میں علمی و ادبی مجلسیں قائم کرتے تھے جس میں مدینہ کے اعیان و اشراف، شعراء، ادباء اور قضاۃ شریک ہوتے تھے، عام طور سے یہ مجلس مغرب اور عشاء کے درمیان منعقد ہوتی تھی، ان کی مجلس میں بغداد کا ایک باوقار، خوش پوش ہاشمی شخص بیٹھتا تھا اور اس کی ظاہری ہیئت

۱؎ جمہرۃ نسب قریش واخبارہا، ص ۱۳۴۔

و حیثیت دیکھ کر زبیر بن بکار نمایاں جگہ بٹھاتے تھے، ایک دن اس نے پوچھا کہ فرزدق شاعر جاہلی یا تمیمی تھا؟ یہ سنتے ہی زبیر بن بکار نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا اور کہا:

اللھم اردد علی قریش اخطارھا۔[1]	اے اللہ! قریش کو اس کی شان و شوکت لوٹا دے۔

فرزدق (ہمام بن غالب) اموی دور کا مشہور شاعر اور جریر کا معاصر تھا اس کا تعلق قبیلہ بنو تمیم سے تھا۔

ایک مجلس کا واقعہ زبیر بن بکار خود یوں بیان کرتے ہیں:

وکان ابو غزیۃ محمد بن موسیٰ	ابو غزیہ محمد بن موسیٰ انصاری اکثر
الانصاری کثیراً ما یجلس الی	میری مجلس میں بیٹھا کرتے تھے ایک
مجلس لیلۃ بین المغرب والعشاء	رات مغرب اور عشاء کے درمیان
الآخرۃ فی مسجد رسول اللہ	میرے پاس بیٹھے، اس وقت وہ
صلی اللہ علیہ وسلم۔ وھو اذ	مدینہ کے قاضی تھے، ہم گفتگو کرتے
ذاک قاض۔ فتحدثنا الی ان ذکرنا	رہے اور باتوں بات میں شعر و شاعری
الشعر، فقال: ابن ابی صبح المزنی	کا ذکر ہونے لگا اور ابو غزیہ نے کہا
اشعر الناس حیث یقول	کہ ابن ابو صبیح مزنی (عدی بن عبداللہ
لعمرک۔	بن عمرو بن ابو صبیح مزنی) سب سے
	بڑا شاعر ہے، اس نے آپ کے چچا کے
	بارے میں یہ اشعار کہے ہیں۔

۱؎ تاریخ بغداد، ج ۸، ص ۴۷۰۔

فما عیشنا الا الربیع ومصعب — یدور علینا مصعب ویدور

وفی مصعب ان غبنا القطر والندی — لنا ورق مغر وورق وشکیر

متی ما یری الرائدون غرۃ مصعب — ینیر بہا اشراقہ فینیر

یروا ملکا کالبدر اما فناؤہ — فرحب واما قدرہ فکبیر

لہ نعم من عد قصر دونہا — ولیس بہا عما یرید قصور

عددنا فاکثرنا وعدت فاکثرت — فقلنا کثیر طیب وکثیر

لعمری لئن عددت نعماء مصعب — لاشکرہا انی اذا الشکور[1]

مصعب بن عبداللہ بن مصعب، زبیر بن بکار کے چچا تھے، وہ بھی علم و عمل، مروت و شرافت، جود و سخا، خطابت اور جاہ و منصب میں قریش کے ممتاز اشخاص میں تھے اور ابوغزیہ محمد بن موسیٰ انصاری امام مالک کے تلمیذ اور مدینہ کے قاضی تھے۔

مجلس وادیٔ عقیق | مدینہ منورہ کے جنوب مغرب میں چند میل پر وادی عقیق بہت لمبا چوڑا علاقہ چھ سات میل میں ہے، وادی عقیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وادیٔ مبارک فرمایا ہے، یہ وادی نہایت سرسبز و شاداب، ہوا نہایت خوشگوار، پانی شیریں و صحت بخش اور فضا فرحت افزا ہے ہرے بھرے کھیت اور نخلستان، امرار اور اہل ثروت کے شاندار قصور و محلات، کنوئیں اور چشمے اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے، وہاں صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کی جاگیریں تھیں، چند قصور و محلات یہ ہیں، قصر عروہ بن زبیر، قصر عاصم بن عمرو، قصر مغیرہ ابوالعاص، قصر عینیہ بن عمرو، قصر علیہ بن سعید، قصر ابوبکر بن عبداللہ، قصر عبداللہ بن ابوبکر، قصر ابراہیم بن ہشام، قصر آل طلحہ بن عمر، قصر خارجہ

[1] جمہرۃ نسب قریش واخبارہا، ص ۲۱۲۔

بن حمزہ، قصر عبداللہ بن عامر، قصر مروان بن حکم، قصر سعید بن عاص وغیرہ، وادی عقیق کے یہ قصور و محلات ارباب جاہ و حشم کے مسکن ہی نہیں تھے بلکہ مدینہ کے علماء و فضلاء، شعراء و ادباء اور باذوق حضرات کے مرجع و مرکز بھی تھے، ان میں ان کی دینی، علمی، ادبی، شعری مجلسیں بھی منعقد ہوا کرتی تھیں اور یاران باصفا کئی کئی دن تک اس تفریحی مقام میں مختلف مباحث و مسائل پر اظہار خیال کرتے تھے، وادیٔ عقیق کی اس اہمیت و عظمت کی وجہ سے کئی اہل علم نے اس کو موضوع بنایا اور کتاب لکھی، زبیر بن بکار اور ابوعلی ہارون بن زکریا ہجری کی کتاب العقیق و اخبارہا زیادہ مشہور ہیں۔

یہاں کی علمی و ادبی مجلسوں اور اہل فضل و کمال کے اجتماعات میں شریک ہونے والے حضرات کو مدتوں ان کی یاد تڑپاتی تھی اور نہایت جذباتی انداز میں ان کا تذکرہ کرتے تھے، عبدالسلام بن یوسف جماہری بغدادی نے وادیٔ عقیق اور اس کے مکینوں اور مجالس کو یوں یاد کیا ہے:

علی ساکنی بطن العقیق سلام — وان اسہرونی بالفراق وناموا

وادی عقیق کے باشندے اگرچہ اپنی جدائی میں مجھے جگا کر خود سو گئے ہیں، ان کو میرا سلام پہنچے۔

حظرتم علی النوم وہو محلل — وحللتم التعذیب وہو حرام

حلال نیند کو تم لوگوں نے مجھ پر حرام کر دیا، اور عذاب کو جو حرام ہے حلال کر دیا ہے۔

اذا نبتم عن حاجر وجبر تم — علی السمع ان یدنو الیہ سلام

جب سے تم نے جدائی اختیار کر لی ہے اور کانوں تک سلام پہونچنے کو روک دیا ہے۔

فلا ہیلت ریح الصبا فرع بانۃ — ولا سجعت فوق الغصون حمام

نہ باد صبا کے جھونکوں نے درخت بان کی ٹہنیوں کو ہلایا اور نہ اس کی ڈالیوں پر فاختہ نے نوا سنجی کی۔

ولا قعقعت فیہ الرعود والکی علی حافتیہ بالعشی غمام

اور نہ وادی عقیق میں بجلیاں کوندیں اور نہ ہی سرِ شام اس کے دونوں کناروں پر بادل برسا

فمالی وما للربع قد بان اھلہ وقد قوضت من ساکنیہ خیام

اب مجھے اس مسکن سے تعلق ؟ جس کے مکیں جا چکے اور وہاں کے باشندوں کے خیمے اکھاڑ دیے گئے

الا لیت شعری ھل الی الرمل عودۃ وھل لی بیتلک الباناتین لمام ؟

اے کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ کیا اسکے مقام رمل میں میری واپسی ہو سکتی ہے اور کیا میں بان کے دونوں درخت کے پاس ٹھہر سکتا ہوں ؟

وھل نھلۃ من بئر عروۃ عذبۃ اداوی بھا قلبا برا ہ اوام ؟

اور کیا میں بیر عروہ کے شیریں پانی سے سیراب ہو سکتا ہوں جس سے اپنے بیمار دل کا علاج کر سکوں ؟

الا یا حمامات الاراک الیکم فمالی فی تغریدکن مرام

اے درخت اراک کی فاختاؤ! تم اپنی راہ لو، کیونکہ تمہاری نواسنجی میں میرے لیے کوئی کشش نہیں ہے۔

فوجدی وشوقی مسعد ومؤانس ونوحی ودمعی مطرب ومدام [1]

میرا وجد و شوق میرے لیے مونس و مددگار ہے اور میری گریہ وزاری اور آنسو میرے لیے مطرب و مدام ہے۔

وادی عقیق کے علمی وادبی اور شعری ولغوی نوادر اور امالی اور مجالس کی صورت ضبط نہیں ہو سکی، اس زمانہ تک اس کا رواج نہیں تھا، زبیر بن بکار اور ابو علی ہجری کی کتابوں میں یہ نوادرات رہے ہوں گے کتاب الاغانی میں شعرائے مدینہ کے نوادر و لطائف مل جاتے ہیں۔

مجلس بیر عروہ | وادی عقیق میں حضرت عروہ بن زبیر کے بہت سے املاک واموال اور نخلستان تھے، لمبی چوڑی جاگیر و جائداد تھی، اس کے درمیان قصر عروہ اور بیر عروہ

[1] المغانم المطابۃ فی معالم الطابۃ، ص ۲۶۲، قسم الامکنۃ۔

اپنی خصوصیات کی وجہ سے وہاں کے سارے قصور وآبار میں ممتاز تھے، بیر عروہ کا پانی کثرت، برودت اور حلاوت میں مشہور تھا، بوتلوں میں بھر کر خلیفہ ہارون رشید کو ہدیہ و تحفہ کے طور پر مقام رقہ بھیجا جاتا تھا، اس کنوئیں کے بارے میں ملکری بن عبد الرحمن انصاری نے کہا ہے:

کفنونی ان مت فی درع اروی واغسلونی من بئر عروۃ ماء

میں مر جاؤں تو مجھے محبوبہ اروی کے قمیص کا کفن دینا اور بیر عروہ کے پانی سے غسل دینا

سخنۃ فی شتاء باردۃ فی الصیف سراج فی اللیلۃ الظلماء

جو جاڑے میں گرم اور گرمی میں سرد، اور شب تاریک میں چراغ ہے۔

یہ کنواں باب عنبریہ سے ۳۵۔۴۰ منٹ کی دوری پر ہے، ۱۳۷۶ھ میں راقم نے پیدل جا کر اس کی زیارت کی اور اس سے سیراب ہوا ہے، مصری حجاج بوتلوں میں اس کا پانی بطور تبرک کے لے جا رہے تھے، اس سے کچھ دور پورب کی جانب قصر سعید بن عاص کے کھنڈر تھے، پتھر کی دیواریں گری پڑی تھیں، اندر نہیں جا سکا۔

حضرت عروہ بن زبیر نے یہاں کے تمام اموال واملاک کو مہمانوں پر وقف کر دیا تھا اور ان کے صاحبزادے ہشام بن عروہ اس کے وارث و نگراں ہوئے اسی بیر عروہ کے پاس ان کی علمی ودینی اور ادبی مجلس برپا ہوتی تھی اور اہل ذوق جمع ہو کر خوش وقت ہوتے تھے، اس مجلس کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، منذر بن عبد اللہ حزامی کہتے ہیں کہ میں نے حدیث کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے تیرہ سال تک اشعار عرب کی روایت کی، ایک مرتبہ میرے والد ہشام بن عروہ کی ملاقات کے لیے گئے، انہوں نے کہا کہ

تمہارا لڑکا مجھے معلوم ہوا ہے کہ اشعار کی روایت کر رہا ہے، اس کو میرے پاس بھیج دینا۔ والد صاحب یہ سُنکر بہت خوش ہوئے اور واپس آکر سواری کا انتظام کیا اور کہا کہ تم کل صبح سویرے وادی عقیق میں ہشام بن عروہ کے پاس چلے جانا، انھوں نے تم کو بلایا ہے۔

فغدوت عليه فوجدته	میں صبح کو ان کے پاس پہنچا تو دیکھا
جالسا في مجلس بئر عروة	مجلس بیر عروہ میں بیٹھے ہیں، میں سلام
فسلمت عليه وجلست معه	کر کے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اشعار عرب یاد کر رہے ہو، تم کو کس قبیلہ کے اشعار زیادہ یاد ہیں؟ میں نے شعرائے بنو سلیم کے نام لیے، انھوں نے کہا کہ کیا بنی سلیم کے فلاں فلاں شعراء کے اشعار بھی تم کو یاد ہیں؟ اور ان سب کے اشعار سُنائے جن کو میں نے ابتک نہیں سُنا تھا، اس کے بعد کہا:

يا ابن اخي! اطلب الحديث۔	بھتیجے! تم حدیث کی تعلیم حاصل کرو

اور اسی دن سے میں نے حدیث کی روایت شروع کر دی۔[1]

بیر عروہ کی ایک مجلس نے منذر بن عبد اللہ حزامی کو شعر و شاعری کی وادی سے نکال کر احادیث نبویہ کی بزم میں پہنچا دیا، اسی طرح معلوم نہیں کتنے مجلس نشین ان مجلسوں سے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور اسی انداز پر انھوں نے مجلس برپا کی، چنانچہ منذر بن عبد اللہ حزامی نے اس روایت کو زندہ رکھا اور قصر اسحاق میں مدتوں علمی و ادبی مجلسیں قائم کی۔

[1] جمہرۃ نسب قریش واخبارہا، ص ۳۰۱ و ص ۳۰۲۔

مجلس قصر اسحاق بن ایوب

منذر بن عبد اللہ بن منذر نے ہشام بن عروہ کی ہدایت کے مطابق حدیث کی تعلیم حاصل کر کے خاندانی روایت کو زندہ رکھا، وہ بھی قریش کے اعیان و اشراف میں بڑے فضل و کمال کے مالک تھے، انھوں نے وادئ عقیق کے قصر اسحاق بن ایوب مخزومی میں اپنی مجلس منعقد کر کے اخوان صفا اور یاران وفا کو جمع کیا، اس مجلس میں علماء، فقہاء، محدثین، شعراء، ادباء کئی کئی دن تک جمع رہتے تھے اور ہر قسم کے موضوع پر کھل کر بحث و مذاکرہ کرتے تھے، زبیر بن بکار کا بیان ہے:

وكان آخى اخوانا اهل فضل	منذر بن عبد اللہ نے اہل علم و فضل،
ودين وادب يخرجون المخارج	اصحاب دین و دیانت، ارباب شعر و ادب
ويكونون بالعقيق الايام	سے برادرانہ تعلقات قائم کیے، یہ لوگ
يجتمعون ويتحدثون وبين ذلك	تفریح گاہوں میں جا کر کئی دن تک
خير كثير، وصلاة، وذكر	وادی عقیق میں پڑے رہتے اور باہمی
وتنازع في العلم[1]	مباحثہ و مذاکرہ کرتے، اس مجلس میں
	بڑی خیر و برکت ہوتی، لوگ نماز پڑھتے
	اللہ کو یاد کرتے اور علمی مناقشہ و مباحثہ
	میں مشغول رہتے تھے۔

اس مجلس اخوان الصفا کے نمایاں ارکان یہ ہیں، عبد المجید بن علی لیثی، عمران بن موسیٰ بن عمران بن عبد اللہ بن عبد الرحمن بن ابوبکر صدیق، صالح بن محمد بن مسور بن ابراہیم بن عبد الرحمن بن عوف، محمد بن طلحہ بن عمیر بن طلحہ بن عامر بن ابو وقاص، مفتی بن

[1] جمہرۃ نسب قریش واخبارہا، ص ۳۹۶۔

عبداللہ بن عنبسہ بن سعد بن عاص۔

بعد میں اس مجلس کی یاد ان احباب واخوان کو تڑپاتی رہی، منذر بن عبداللہ نے بغداد چلے جانے کے بعد اپنے جذبات یوں ظاہر کیے ہیں،

من مبلغٌ عُصَبَ المجيد ودونه ۔ مسيرة شهر او يزيد على شهر

کون ہے جو ایک ماہ یا اس سے زیادہ مسافت پر رہنے والے عبدالمجید کو۔

وعمران والرهط الذين تركتهم ۔ بطيبة في الفرع المهذب من فهر

اور عمران کو اور قبیلہ فہر کی جماعت اشراف کو جنھیں میں نے مدینہ منورہ میں چھوڑا ہے

والفهم من معشر قد بلوتهم ۔ يزيدون طيبا حين يبلون بالخبر

اور ان احباب کو جنھیں میں نے آزمایا تو اور بھی صاف دل اور مخلص نکلے۔

باني لما شطت النوى بيننا ۔ واشفقت ان لا نلتقي آخر الدهر

یہ خبر پہونچا دے کہ جب مختلف مقام نے ہم کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور مجھے خطرہ ہوا کہ تا حیات ہم نہیں مل سکیں گے۔

ذكرتكم فاعتادني الشوق والاسى ۔ وضاق بما اضمرت من ذكركم صدري

تو میں نے تم لوگوں کو یاد کیا، ملاقات کا شوق اور فراق کا غم میری عادت بن گیا ہے اور تمہاری یاد سے میرا سینہ تنگ ہو گیا ہے۔

واعجبني ان لم تفض عين واحد ۔ غداة الوداع من مقيم ومن سفر

اور مجھے تعجب ہوا کہ جدائی کی صبح کو کسی مقیم اور مسافر کی آنکھ نے آنسو نہیں بہایا۔

كانا علمنا اننا سوف نلتقي ۔ ولست اخال تعلمون ولا ادري

گویا ہم سب جانتے تھے کہ عنقریب ملیں گے مجھے معلوم نہیں کہ تم لوگ اس بات کو جانتے تھے،

أآخر عهد بيننا ذاك ام لنا ۔ تلاق على ما نشتهي باقي العصر

کہ یہ ہمارے تمہارے درمیان آخری ملاقات ہے، یا آئندہ زمانہ میں ہماری خواہش کے مطابق ملاقات ہوگی۔

فاقسم لا انساكم ولو حال دونكم ۔ من الارض غيطان المتوهة الغبر

خدا کی قسم میں تم لوگوں کو نہیں بھول سکتا، اگرچہ تمہارے ہمارے درمیان بے نام و نشان زمین کی وسعتیں حائل ہیں۔

ولا مجلسا في قصر اسحاق بينكم ۔ تنازعنا في محكم الراي والشعر

اور نہ ہی قصر اسحاق کی مجلس بھول سکتا ہوں جس میں ہمارے درمیان اصابت رائے اور شعر و شاعری پر بحثیں ہوتی تھیں۔

ولهو من اللهو الجميل تزينه ۔ خلائق اقوام عففن عن الغدر

اور اس میں دلچسپ کھیل تھے۔ جن کو وفادار احباب کے حسن اخلاق نے اور بھی دلچسپ بنا دیا۔

وابرازهم ذات النفوس كما ترى ۔ لهم خلقا يوما بذي ولا يزري

وہ اپنے دل کی باتوں کو کھل کر ظاہر کرتے تھے اور کسی دن ان سے کوئی معیوب حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی۔

منذر بن عبداللہ نے بغداد جا کر مدینہ کے جن احباب واخوان کے نام یہ مکتوب روانہ کیا تھا اس مدت میں ان میں سے اکثر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے ایک صاحب نے ان کو وادی عقیق کی سیر و تفریح کے لیے بلایا تو اس کے جواب میں منذر بن عبداللہ نے لکھا

قل للصديق الذي جاءت رسائله ۔ واعملت كاتبا نحوي وقرطاسا

جس دوست کے خطوط میرے پاس آئے ہیں، اس سے کہہ دو کہ

يدعو الى نزهة قد كنت آلفها ۔ حتى علا بيننا ما فرق الناسا

مجھے ایسی تفریح کی دعوت دے رہا ہے جس سے میں مانوس تھا، یہاں تک کہ انسانوں کو جدا کرنے والی بات نے ہم میں راستہ پا لیا۔

۱؎ جمہرۃ نسب قریش واخبارہا ص ۹۰۔ ۳۹۷ و تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۲۵۰، ۲۲۲۔

موت تخون اخوانی فشتتهم   فاصبحوا فرقا ھاما وارماسا

یعنی موت نے میرے احباب کو جدا کر دیا اور وہ الگ الگ قبروں میں سو گئے۔

الفتینی ذاهلا انی رزیتهم   بیض الوجوہ ذوی عز واناسا

تم مجھکو ان سے غافل پا رہے ہو، حالانکہ ان روشن چہرہ معزز اور مانوس لوگوں کی جدائی سے مصیبت زدہ ہوں۔

فلن تقر بعیش بعدهم ابدا   عینی وقد شربوا بالموت الکاسا

ان کے بعد کبھی بھی میری آنکھ ٹھنڈی نہیں ہوگی، انھوں نے موت کا پیالہ پی لیا ہے۔

الا لتعترة نسیانا فان ذکروا   هاج ادکارهم للقلب وسواسا[1]

البتہ کبھی غفلت ہو جاتی ہے اور جب یاد آجاتے ہیں تو ان کی یاد دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیتی ہے۔

مجلس بنی المولیٰ قبا مہاجرین اولین کا پہلا تعلیمی مرکز تھا اور جنکے بال بچے ساتھ نہیں ہوتے تھے وہ حضرت کلثوم بن ہدم کے خالی مکان بیت العزاب میں قیام کرتے تھے، قبا میں مجلس بنی المولیٰ کے نام سے ایک مجلس تھی جس کا اجمالی تذکرہ علامہ مجد الدین نے المغانم المطابہ میں کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ قبا میں بنو عمرو بن عوف نے مجلس بنی المولیٰ اور حمام کے درمیان بحرج نامی ایک قلعہ تعمیر کیا تھا، جس کے مالک بنی عزیزہ بن مایک تھے اور بنو عمرو بن عوف ہی نے ایک اور قلعہ شنیف نامی تعمیر کیا تھا، جو ابو سفیان بن حارث کے مکان کے قریب احجار المرا اور مجلس بنی المولیٰ کے درمیان تھا، اس کے مالک بنو ضبیعہ بن زید تھے[2]۔ غالباً اس مجلس میں ان دونوں قلعوں کے افراد بیٹھتے تھے اور دیگر مجالس کی طرح مختلف موضوعات پر بحث و مذاکرہ کرتے تھے، بنو عمرو بن عوف میں مشاہیر صحابہ و تابعین اور اہل علم و فضل گذرے ہیں، یہاں انکی مجلس برپا ہوتی رہی ہوگی۔

---

[1] جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا، ص ۹۹۔ ۳۹۰ و معجم الشعراء مرزبانی، ص ۳۶۸ [2] المغانم المطابہ، ص ۱۵، ۳۰۹۔

مصطفیٰ صادق الرافعی

از جناب ابو سفیان اصلاحی۔ علی گڑھ

فرانسیسی اور انگریزی تہذیب و تمدن کے اثر سے مصر میں ایک ایسا طبقہ ظہور پذیر ہوا جو مغربی ثقافت کا اس قدر عاشق اور دلدادہ تھا کہ وہ مشرقی علوم کو نظر انداز کرنے کے علاوہ انہیں ذلت و حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا، اس طبقہ کی جانب سے قرآن کریم، احادیث نبوی اور صحابۂ کرام پر طرح طرح کے رکیک اعتراضات کیے گئے جو دلائل و شواہد سے خالی اور مستشرقین کی تقلید اور تائید کا نتیجہ تھے، اسلام سے دلچسپی رکھنے والے جن ادیبوں اور مصنفین نے ان مہمل اور بے سرو پا اعتراضات کے علمی جواب دیے، ان میں ایک ممتاز نام مصطفیٰ صادق الرافعی کا بھی ہے۔

رافعی شامی النسل تھے، لیکن ان کی ولادت ۱۸۸۰ء میں مصر میں ہوئی، ان کا سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت عمرؓ سے ملتا ہے، ان کے خاندان میں متعدد اصحاب علم و کمال پیدا ہوئے، رافعی کے والد عبد الرزاق رافعی مختلف ملکوں میں محکمۂ عدالت شرعیہ کے صدر رہے، حنفی المسلک تھے۔ لیکن مصطفیٰ صادق رافعی شافعی مسلک کو ترجیح دیتے تھے[1]

---

[1] محمد سعید العریان، حیاۃ الرافعی۔ طبع ثالث۔ مطبع الاستقامہ۔ قاہرہ ۱۹۵۵ء ص ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۷۔

رافعی کے خاندان میں دینداری، زہد و ورع اور بزرگوں کی عزت و احترام کی روایتیں پہلے سے چلی آرہی تھیں[1] ان کی نشوونما اسی ماحول میں ہوئی، بارہ برس کی عمر سے باقاعدہ اسکول جانا شروع کیا۔

رافعی معمولی فرانسیسی بھی جانتے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد چند برس تک وہ علمی زندگی سے کنارہ کش رہے، اس کے بعد جب مطالعہ کتب کا سلسلہ شروع کیا تو سارا وقت اسی میں گزارتے، جب وہ طانطا کی عدالت میں محرر تھے تو روزآنہ ٹرین سے آتے جاتے راستہ بھر کتب بینی میں محو رہتے، اسی حالت میں انھوں نے نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا، غرض مسلسل محنت و مطالعہ سے ان کی نظر میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی، وہ اسلام کے ہمیشہ شیدائی رہے[2] ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم ادب پر فریفتہ تھے اور جدید افکار و احساسات سے زیادہ آشنا نہ تھے۔

رافعی کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ اس میدان میں تمام شعرا سے گوئے سبقت لے جانا چاہتے تھے، رافعی اور حافظ میں گہری رفاقت تھی، یہ تعلقات آخری وقت تک قائم رہے، وہ عراق کے عظیم شاعر محسن الکاظمی کے بھی بہت مداح تھے، انھیں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرتے، شاعری میں انھوں نے اپنے معاصرین شعرا بارودی، حافظ اور کاظمی کے اثرات قبول کیے، شوقی، صبری اور مطران کا شمار بھی اسی قبیل سے تھا۔

۱۹۰۳ء میں رافعی کا پہلا دیوان شائع ہوا جو مقبول ہوا، اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں

---

۱ نعمات احمد فواد، دراسۃ فی ادب الرافعی۔ دار الفکر العربی (بدون تاریخ) ص ۲۴-۲۵

۲ حیاۃ الرافعی۔ ص ۲۸۔

دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا اور ۱۹۰۶ء میں تیسرا دیوان زیور طباعت سے آراستہ ہوا اور ۱۹۰۸ء میں دیوان النظرات کا پہلا حصہ قارئین کے ہاتھوں میں آیا، مسلسل طبع آزمائی کی وجہ سے وہ شاعری کی دنیا میں ایک انفرادی حیثیت کے مالک بن گئے[1]

چوبیس سال کی عمر میں رافعی کی شادی ہوئی، ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار تھی اور ان کا برتاؤ اپنے بال بچوں سے بہت اچھا تھا۔ وہ گو اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے تاہم جہاں سختی کا موقع ہوتا وہاں سختی سے بھی کام لیتے[2]

۱۹۰۵ء میں نثر نگاری کی طرف میلان ہوا تو مقالہ نگاری کے ساتھ ہی مستقل کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ بھی شروع کیا[3]۔ جو شاعری کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں، وہ شاعر کی حیثیت سے کم اور نثر نگاری کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔

۱۹۱۰ء میں ان کی اہم کتاب "تاریخ آداب العرب" منظر عام پر آئی، جس نے مخالفین کو حیرت زدہ کردیا، اسی کا دوسرا حصہ اعجاز القرآن کے نام سے شائع ہوا۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد رافعی اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئے[4]۔ علامہ رشید رضا نے بھی اس کتاب کو سراہا ہے[5]

۱۹۱۲ء میں "حدیث القمر" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی، جس میں ایک لبنانی شاعرہ کا تعارف کرایا ہے، اس سے ان کا گہرا تعلق تھا، یہ کتاب اسلوب و انداز بیان کے اعتبار سے عربی ادب میں ایک اضافہ تھا[6]

---

۱ حیاۃ الرافعی، ص ۵، ۲ دراسۃ فی الادب الرافعی، ص ۷، ۳ اعجاز القرآن، مصطفیٰ صادق الرافعی، طبع ہشتم، المکتبہ التجاریہ مصر، ۴ حیاۃ الرافعی، ص ۱۷، ۵ مصطفیٰ صادق الرافعی، تاریخ آداب العرب، طبع ثانی، دار الکتاب العربی بیروت لبنان ۱۹۷۴ء، ص ۲۱، ۶ مصطفیٰ صادق الرافعی، حدیث القمر، طبع سابع، مطبعۃ الاستقامۃ، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۳

کتاب المساکین ۱۹۱۷ء میں شایع ہوئی، اس میں جنگ عظیم کے احوال کا ذکر ہے، اس سے ان کے مجروح جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے[1]

اغانی الشعب، میں قومی اور ملی نغمے ہیں، اس سے بلند ہمتی اور جرأت پیدا ہوتی ہے،

اس کا پہلا حصہ ۱۹۰۳ء میں شایع ہوا تھا[2]

رسائل الاحزان ۱۹۲۴ء کی تصنیف ہے، اس میں انہوں نے ایک خیالی دوست کی مدد سے اپنی داستان محبت اور امیدوں کو بیان کیا ہے[3]

اوراق الورد[4] ۱۹۳۱ء میں منظر عام پر آئی، اس میں حسن و عشق اور الفت و محبت کے جذبات و احساسات فلسفیانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، اس لیے ان کا نظریۂ فلسفۂ عشق عیاں ہوتا ہے[5]، یہ دوستوں کے خطوط کا مجموعہ ہے[6]

رافعی کی کتابوں اور مقالات سے معاصر ادیبوں کو شدید اختلاف تھا۔ عبداللہ عفیفی، ترکی مبارک، طہٰ حسین اور عقاد نے ان کے خیالات پر شدید ردعمل کا اظہار کیا[7]۔ وہ اپنے مخالفین کے لیے نہایت سخت لب و لہجہ اختیار کرتے تھے، ان کے دل میں تجدد پسند ادیبوں کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا، عقاد، مازنی اور طہٰ حسین کی جدت پسندی سے انہیں سخت نفرت تھی "تحت رایۃ القرآن" طہٰ حسین کے نظریات ہی کے رد عمل میں منظر عام

---

[1] کتاب المساکین ص ۵ [2] حیاۃ الرافعی ص ۸۳ [3] مصطفیٰ صادق الرافعی، رسائل الاحزان، طبع سادس، مطبع الاستقامہ۔ قاہرہ، ۱۹۵۲ء ص ۲۲، نیز ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی ص ۱۲۷ [4] مصطفیٰ صادق الرافعی، اوراق الورد، طبع خامس، مطبع الاستقامہ، قاہرہ، ۱۹۵۳ء [5] حیاۃ الرافعی ص ۱۴۱ [6] ایضاً ص ۳۶ [7] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المعارک الادبیہ ص ۳، ۸۳ و مابعد، احمد الجندی، مصطفیٰ صادق الرافعی، المجمع العلمی العربی، دمشق۔ اپریل ۱۹۷۱ء، ۴۶/۲، ص ۴۱۲۔

پر آئی[1]۔ عبداللہ عفیفی سے رافعی کے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ رافعی کے خیال میں انہیں "شاعر الامیر" کا جو لقب دیا گیا ہے، یہ اس کے اہل نہیں ہیں، عقاد ان کے نظریۂ اعجاز قرآن کے منکر تھے اور انہیں صاحب علم بھی نہیں مانتے تھے۔

مختلف علمی، ادبی اور دینی خدمات انجام دیتے ہوئے مصطفیٰ صادق الرافعی ۹ مئی ۱۹۳۷ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے[2]

ذیل میں رافعی کی تصانیف کی ایک فہرست پیش کی جا رہی ہے، اس میں وہ بھی شامل ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ (۱) دیوان الرافعی (تین جلدیں) (۲) دیوان النظرات (۳) ملکۃ الانشاء (۴) تاریخ آداب العرب (۵) اعجاز القرآن (۶) حدیث القمر (۷) المساکین (۸) نشید سعد پاشا زغلول (۹) النشید الوطنی المصری (۱۰) رسائل الاحزان (۱۱) السحاب الاحمر (۱۲) المعرکۃ تحت رایۃ القرآن (۱۳) علی السفود (۱۴) اوراق الورد (۱۵) رسالۃ الحج (۱۶) وحی القلم (تین جلدیں)

غیر مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں، (۱) تاریخ آداب العرب (جلد سوم) (۲) اسرار الاعجاز (۳) دیوان اغانی الشعب (۴) مقالات جو مختلف جرائد و رسائل میں منتشر پڑے ہیں (۵) ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۷ء تک کی شاعری ابھی تک مجموعہ کی صورت میں منظر عام پر نہیں آئی۔ اسی میں ان کی عشقیہ شاعری اور بادشاہ فواد کی شان میں کہے گئے مدحیہ قصائد بھی شامل ہیں[3]

---

[1] مصطفیٰ صادق الرافعی۔ تحت رایۃ القرآن۔ طبع رابع۔ مطبع الاستقامہ قاہرہ، ۱۹۵۶ء ص ۸ [2] المعارک الادبیہ ص ۲۲۱ نیز ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی، ص ۱۸۵، ۱۹۰، ۲۱۵، ۲۱۷ [3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی، ص ۳۴۹۔ ۳۵۳۔

رافعی کی مقالہ نگاری

انیسویں صدی کے بعد اور بیسویں صدی کے اوائل میں مصر سے متعدد جرائد ورسائل شایع ہورہے تھے، اسی زمانے میں مصطفیٰ صادق رافعی کی مقالہ نگاری کی ابتدا ہوئی اور انہوں نے البیان، النشریا، الثقافہ، الرسالہ، المقتطف، الزہراء، العصور اور المنیر میں مضامین لکھے۔

رافعی کے مقالات میں اسلامی اور ادبی رنگ غالب ہے، زبان وبیان بہت مرصع ہے، پہلے واضح کیا جاچکا ہے کہ وہ قدیم کلاسیکی ادب سے متاثر تھے، جاحظ اور ابوالفرج کی تحریروں کے شیدائی تھے[۱] سعد زغلول نے کہا کہ "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اعجاز القرآن ایک الہامی کتاب ہے یا قرآن کریم کا کوئی اقتباس ہے"[۲] اکثر مقالات میں قرآن اور حدیث پر کیے جانے والے بے بنیاد اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، انکے مقالات تین[۳] طرح کے ہیں ۱۔ سیرت پاک سے متعلق مقالات ۲۔ معاشرتی مقالات ۳۔ ادبی مقالات۔

سیرت پاک سے متعلق مقالات

ایک مقالہ کی تمہید میں بتایا ہے کہ نبی ایک سورج کے مانند ہوتا ہے، جس طرح سورج کے طلوع ہونے سے تاریکیاں دور ہوجاتی ہیں اسی طرح ایک نبی کی بعثت سے جہالت وضلالت اور فحاشی دور ہوجاتی ہے اور ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل جاتی ہے، اضطراب امن وآشتی میں تبدیل ہوجاتا ہے اور بغض وحسد کی جگہ الفت ومحبت لے لیتی ہے۔

اسی مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ زندگی جیسی بیش قیمت چیز کو انبیائے کرام کے اقوال

۱۔ حیاۃ الرافعی، ص ۱، ۲۔ مصطفیٰ صادق الرافعی، تاریخ آداب القرآن، طبع ثانی۔ دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان۔ ۲/ ۲۰۰۸ء۔

وافعال اور تعلیمات ہی سے صحیح رخ لگایا جاسکتا ہے، نبی بنی نوع انسان کے لیے خدا کی طرف سے نذیر اور معلم اخلاق ہوتا ہے، اسے ہر طرح کی صلاحیت سے نوازا جاتا ہے وہ حد درجہ فصیح وبلیغ ہوتا ہے تاکہ اس کی باتیں موثر ہوں اور لوگوں کے دلوں میں اتر جائیں۔ اس کی گفتگو تمثیل نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔ اس کی باتیں تضاد سے خالی ہوتی ہیں، نبی کی بعثت اس وقت ہوتی ہے جب دنیا ظلمت وتاریکی میں گم ہوجاتی ہے، وہ آنے کے بعد تاریکیوں کو دور کرکے روشنی پھیلاتا ہے۔

نبی کے تعارف کے بعد بتایا کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے جس بلند درجہ پر فائز ہیں، وہاں تک دنیا کے تمام حکماء وفلاسفہ پہنچنے سے قاصر ہیں، آپ کی ذات لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ تھی۔ آپ کی زندگی کے تمام پہلو تا قیامت تابندہ رہیں گے۔

آپ اس حیثیت سے بھی عظیم اہمیت کے حامل ہیں کہ آپ کی شریعت آخری اور مکمل ترین تھی جو ہر نقص وعیب سے پاک ہے[۱] انہوں نے اسلامی احکام کی حکمت ومصلحت اور ان کے معتدل ومناسب اور فطرت انسانی کے عین مطابق ہونے کو واضح کرکے دکھایا ہے کہ ان کی پیروی میں تمام کامیابیوں کا راز پنہاں ہے۔

رافعی نے اپنے مقالہ "وحی الہجرۃ" میں بتایا کہ ہجرت سے قبل کفار مکہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتیں دیں، آپ کو کاذب کہا گیا، آپ کی اہانت کی گئی اور آپ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا۔

مشرکین عرب آپ کے چچا ابوطالب کے پاس شکایت کے لیے گئے، آپ نے جب

۱۔ مصطفیٰ صادق الرافعی۔ وحی القلم طبع سادس، مطبع الاستقامۃ قاہرہ (بدون تاریخ) ۲/ ۳-۲، ۵۔

محسوس کیا کہ میری وجہ سے چچا کو تشویش ہے اور وہ میری مدد کرنے سے قاصر نظر آرہے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھدیں پھر بھی میں اپنے اس کام سے باز نہیں آسکتا اب اللہ تعالیٰ مجھے چاہے ہلاک کرے اور چاہے فتح و نصرت سے ہم کنار کرے۔ اس کے بعد آپؐ کی آنکھیں غمناک ہوگئیں[1]۔

ایک دوسرے مقالہ میں رافعی نے بتایا کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہ کی ذات آپؐ کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ قدم قدم پر ان سے آپؐ کو تسلی ملتی تھی، نبوت کے دس سال پورے ہونے کے بعد یہ دونوں سہارے رخصت ہوگئے، ابو طالب قریش کی تکالیف سے آپ کو بچاتے اور حضرت خدیجہ نے پریشانیوں میں آپؐ کو سکون دیا اور آپؐ کی ان تمام باتوں کو بخوشی تسلیم کیا جن سے لوگوں نے اعتراض کیا۔ رافعی نے اس میں آپؐ کو دی جانے والی دوسری اذیتوں اور طائف میں آپ کو لہولہان کیے جانے کا ذکر کرکے دکھایا ہے کہ آپؐ نے کس قدر عزم و استقلال سے مشکل حالات کا مقابلہ کیا اور کبھی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے[2]۔

ایک مقالہ میں رافعی نے واقعۂ معراج کا ذکر کرکے آپؐ کی عظمت و بلندی اور غیر معمولی فضل و کمال کو دکھایا ہے[3]۔

اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ معراج جسمانی ہوئی تھی اور یہی جمہور علماء کا خیال بھی ہے۔ اس خیال کو بھی ترجیح دی جائے گی کہ معراج جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ سورہ النجم کی آیت اذ یغشی السدرۃ ما یغشی۔ ما زاغ البصر وما طغی سے انکے نزدیک یہی ثابت ہوتا ہے اور اس کی وضاحت انھوں نے اپنے موثر انداز میں کی ہے۔

۱؎ وحی القلم ۲/۱۰۰۷، ۹۱، ۲؎ وحی القلم ۲/۴۲، ۲۵، ۲۹ ۳؎ وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: ۲/۳۱

جسمانی معراج کے سلسلے میں دوسری مثال یہ دی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ملکوتی و بشری صفات کے مالک تھے۔ عربوں کو سمجھانے کے لیے براق کو جانور کہا گیا ہے یہ دراصل برق سے بنا ہے جس کے معنی بجلی کے ہیں اور یہی اس سے مراد بھی ہے کہ یہ ایک کہربائی قوت ہے جو ایک جست میں تمام عالم کو طے کرلیتی ہے[1]۔

اپنے ایک مقالہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو موضوع بحث بنایا ہے کہ کسی ایک شخص میں ان کا جمع ہونا محال ہے اور ثابت کیا ہے کہ ایسا ہی افضل و اکمل اور جامع صفات شخص لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے مامور کیا جاتا ہے جو ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہو۔

ایک مقالہ میں دکھایا ہے کہ امت آپؐ کی دعوت و تعلیم کی اشاعت اور کتاب و سنت کے احکام کی تبلیغ پر مامور کی گئی ہے۔

اسی مقالہ میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ آپؐ کے تمام اقوال ادبی و فنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ افکار و معانی سے پُر ہوتے ہیں۔

آپؐ کے اسلوب بیان کی دلکشی و دلاویزی اور اثر و نفوذ کا ذکر بھی کیا ہے اور احکام محمدی کی حکمت و خوبی بھی بیان کی ہے اور کلام رسول کو موجودہ دور کے اقتضا کے مطابق نئے انداز میں مدون کرنے پر زور دیا ہے[2]۔ (باقی)

۱؎ وحی القلم ۲/۳۷ و ۳۸ ۲؎ ایضاً ۳/۹، ۱۵، ۱۶، ۳۴۔

امام ابو عمرو زبان بن العلاء البصری

از

جناب محمد الیاس الاعظمی۔

امام ابو عمرو زبان بن العلاء بصریؒ گوناگوں اوصاف و کمالات کے جامع تھے وہ قرآن و حدیث، لغت و عربیت، نحو اور شعر و ادب میں یکتائے روزگار تھے، زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں بھی ممتاز تھے، ان کو درس و تدریس کے ساتھ ہی تصنیف و تالیف سے بھی سروکار رہا، لیکن ان کا اصل سرمایہ افتخار علم قرأت ہے اسکے حصول و فروغ میں انہوں نے اپنی پوری زندگی صرف کر دی اور اس فن کے امام کہلائے۔

نام و نسب | زبان نام، ابو عمرو کنیت، والد کا نام العلاء اور شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:

ابو عمرو زبان بن العلاء بن عمار بن عریان بن عبداللہ بن حسین بن حارث بن جلہمہ[1] بن حجر بن خزاعی بن مازن بن مالک بن عمرو بن تمیم بن مر بن اد بن طانجہ بن الیاس بن مضر بن معد بن عدنان[2]

[1] علامہ ابن الجزری نے یہی نام لکھا ہے مگر اکثر تذکرہ نگاروں نے جلہم لکھا ہے [2] علامہ ابن الجزری، غایۃ النہایہ فی طبقات القراء ۱/ ۲۸۸، مکتبہ الخانجی، مصر ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء۔

ان کے شجرۂ نسب میں قدرے اختلاف ہے، مذکورہ بالا نسب نامہ علامہ ابن الجزری کی تحقیق کا نتیجہ ہے، نام میں بھی اختلاف ہے، تقریباً تیس نام ملتے ہیں صاحب روضات الجنات اور علامہ جلال الدین سیوطی نے ان کے اکیس ناموں کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) ابو عمرو (۲) زبان (۳) جبر (۴) جنید (۵) جزو (۶) حماد (۷) حمید (۸) خیر (۹) ربان (۱۰) عتیبہ (۱۱) عثمان (۱۲) عریان (۱۳) عقبہ (۱۴) عمار (۱۵) عیاد (۱۶) عیینہ (۱۷) قائد (۱۸) قبیصہ (۱۹) محبوب (۲۰) محمد (۲۱) یحیٰی وغیرہ۔[1]

ابن باذش نے زبان، ابو العلاء نے ریان، عمرو بن شبہ، ابن العماد حنبلی، ابن خلکان، ابن الانباری اور الدکتور شوقی ضیف نے ان کی کنیت ہی کو ان کا نام قرار دیا ہے[2] اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا نام زبان ہی لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بقول علامہ ابن الجزری اکثر علماء و حفاظ کے نزدیک ان کا نام زبان ہے[3] علامہ ذہبی نے بھی اسی کو صحیح بتایا ہے،[4] صاحب روضات الجنات نے بھی ابو عمرو کا صحیح نام زبان ہی لکھا ہے[5]، صاحب نزہۃ الالباء نے بھی واسمہ زبان

[1] محمد باقر الحاجی الموسوی، روضات الجنات ۲/ ۳۹۹، مطبوعہ ۱۳۰۴ھ و علامہ جلال الدین سیوطی، بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ ۲/ ۲۳۱ مطبع السعادۃ مصر، طبع اول ۱۳۲۶ھ [2] غایۃ النہایہ ۱/ ۲۸۹ و علامہ شمس الدین ذہبی، معرفۃ القراء الکبار ۱/ ۱۰۰ موسسۃ الرسالہ بیروت ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء و ابن العماد حنبلی، شذرات الذہب ۱/ ۲۳۷ مکتبہ القدسی قاہرہ ۱۳۵۰ھ و ابن خلکان ۱/ ۳۸۶ و ابن الانباری، نزہۃ الالباء ص ۳۰ و الدکتور شوقی ضیف، المدارس النحویہ ص ۲۰ دار المعارف قاہرہ [3] غایۃ النہایہ ۱/ ۲۸۹ [4] ایضاً و معرفۃ القراء ۱/ ۱۰۰ [5] روضات الجنات ۴/

لکھا ہے[1] اصمعی کا بیان ہے کہ مجھ خود ابوعمرو نے اپنا یہی نام بتایا تھا[2]

علامہ جلال الدین سیوطی اور صاحب روضات الجنات اس اختلاف کی یہ وجہ تحریر کرتے ہیں:

وسبب الاختلاف فی اسمه	ان کے نام میں اختلاف کا سبب یہ
انه كان لجلالته لا يسئل	ہے کہ کسی نے ان کی جلالت کی وجہ
عنه[3]	سے انکا نام نہیں پوچھا۔

ابوعمرو کے نام کی طرح ان کے والد کے نام میں بھی اختلاف ہے، العلاء اور عمار عریان کے علاوہ صاحب روضات الجنات نے عبد العلاء لکھا ہے[4] خیر الدین زرکلی نے العلاء کو ابوعمرو کے والد کا لقب بتایا ہے[5] لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کا نام العلاء تھا جیسا کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔

ابوعمرو خالص عرب تھے[6] ابوعبیدہ فرماتے ہیں:

وكان من اشراف العرب	ابوعمرو عرب کے نمایاں اور ممتاز
ووجوههم[7]	لوگوں میں سے تھے۔

مگر قاضی اسد یزیدی کا بیان ہے کہ ابوعمرو فارس کی ایک مشہور جگہ کازرون کے رہنے والے تھے[8]، علامہ ابن القاصح بغدادی نے بھی انہیں کازرونی الاصل لکھا ہے[9]، علامہ ابن الجزری نے اس بارے میں تین اقوال نقل کیے ہیں، اول یہ کہ ابوعمرو کا

[1] نخبۃ الالباء ص ۲۹ [2] معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ [3] بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۶۷ [4] روضات الجنات ۲/۳۹۹ [5] ایضاً [6] الاعلام ۳/۴۱ [7] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴ [8] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۹ [9] علامہ ابن القاصح بغدادی سراج القاری المبتدی ص ۰۱۰، ادارۃ الفکر مصر طبع چہارم ۱۹۷۸ء۔

تعلق بنوحنیفہ سے تھا، بنوحنیفہ شمالی عرب میں قبیلہ بکر بن وائل کی ایک شاخ تھی۔

دوم یہ کہ وہ بنی عنبر سے تھے، سوم یہ بنوتمیم سے ان کا خاندانی تعلق تھا[1] لیکن ایران سے ابوعمرو کا تعلق واضح نہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ تمیمی تھے، حافظ ابوالعلا ہمدانی کا بیان ہے کہ ماہرین نسب کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ابوعمرو تمیمی تھے[2]

نسبت

قبیلہ بنوتمیم کے حلیف قبیلہ مازن سے تعلق کی بنیاد پر مازنی اور قبیلہ بنوتمیم سے نسبی تعلق کے سبب تمیمی کہے جاتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جداعلیٰ تمیم کی طرف منسوب ہو کر وہ تمیمی کہلاتے ہیں مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ اوپر ابوالعلا ہمدانی کا قول گذر چکا ہے کہ وہ ماہرین نسب کے نزدیک تمیمی ہیں۔

مدۃ العمر بصرہ میں اقامت گزینی کی وجہ سے بصری اور فن نحو میں ید طولیٰ رکھنے کی وجہ سے نحوی وغیرہ نسبتوں سے معروف ہیں۔

پیدائش وطن اور پرورش

امام ابوعمرو ۶۸ھ/۶۸۷ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے[3]، علامہ ابوعمرو عثمان دانی اور عبد الوارث کا بیان ہے کہ ابوعمرو بن العلاء کی جائے پیدائش مکہ معظمہ ہے پرورش و پرداخت بصرہ میں اور وفات کوفہ میں ہوئی[4]

بعض لوگوں نے علامہ ابن الجزری کی تصنیف غایۃ النہایہ (۱/۲۹۲) کے حوالہ سے قاری عبد الوارث کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابوعمرو کی ولادت ایران کے مشہور شہر کازرون میں ہوئی، مگر غایۃ النہایہ میں یہ قول مذکور نہیں بلکہ اسکے برعکس قاری عبد الوارث کا یہ بیان مذکور ہے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے[5]

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۸، ۲۸۹ [2] ایضاً ۱/۲۸۸ [3] ایضاً ۱/۲۸۹ و معرفۃ القراء ۱/۱۰۱
[4] ایضاً و غایۃ النہایہ ۱/۲۹۲ و الاعلام ۳/۴۱ [5] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۲۔

سنہ ولادت ۵۵ھ، ۶۵ھ اور ۷۰ھ بتایا جاتا ہے[1] مگر اول الذکر ہی زیادہ مشہور و معروف ہے۔

ابو عمرو کے تین بھائیوں کا ذکر ملتا ہے، جنکے نام یہ ہیں۔

(۱) ابو سفیان بن العلاء (۲) معاذ بن العلاء (۳) ابو حفص عمر بن العلاء۔

امام ابو عمرو بن العلاء اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے[2]

اساتذہ و شیوخ امام ابو عمرو نے مکہ، مدینہ، بصرہ اور کوفہ کے اجلہ تابعین اور ائمہ علوم و فنون کی ایک سرکردہ جماعت سے کسب فیض کیا جن کی تعداد سترہ بتائی جاتی ہے اور بقول علامہ ابن الجزری قرائے سبعہ میں سب سے زیادہ اساتذہ ابو عمرو کے ہیں[3]، چند نامور شیوخ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حسن بن ابوالحسن بصری، حمید بن قیس الاعرج، ابو العالیہ رفیع بن مہران ریاحی، سعید بن جبیر، شیبہ بن نصاح، عاصم بن ابوالنجود، عبداللہ بن اسحاق حضرمی، عبداللہ بن کثیر مکی، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ بن خالد مخزومی، مجاہد بن جبیر، محمد بن عبدالرحمٰن بن محیصین، نصر بن عاصم، ولید بن یسار، ابو جعفر یزید بن القعقاع مدنی یزید بن رومان، یحییٰ بن یعمر وغیرہ[4]

ابو عمرو کے شیوخ میں ابو العالیہ کا بھی نام آتا ہے، مگر علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ گو انہیں ابو العالیہ کے بیس سال کا زمانہ ملا تاہم ان سے استفادہ کی روایت درست نہیں[5]۔

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۹ و ابن خلکان ۱/۱۰۷ [2] علامہ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ طبع اول دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد دکن و معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ و روضات الجنات ۲/۳۹۹

[3] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۹ [4] ایضاً و تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۸ [5] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴۔

سند و سلسلہ قرأت امام ابو عمرو بصری کی قرأت دو واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتی ہے، انہوں نے مجاہد بن جبیر، عکرمہ بن خالد اور عطاء بن ابی رباح وغیرہ اجلہ تابعین سے فن قرأت کی تحصیل کی اور ان حضرات نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا جنھوں نے براہ راست آنحضور صلعم سے اس کی روایت کی ہے۔

حلقہ فیض اور طلبہ کا ازدحام امام ابو عمرو کے حلقہ فیض سے وابستہ تبع تابعین اور انکے اتباع کے علم و فضل اور علوئے کمال و قبولیت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انکا حلقہ درس کس درجہ شاندار رہا ہوگا، قرآن مجید کا درس جامع بصرہ میں دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ حدیث شریف، لغت و عربیت، شعر و ادب، نحو وغیرہ کی تحصیل و تکمیل بھی ان سے بےشمار طلبہ نے کی، وہ جب بصرہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی یہی کیفیت رہی، شیخ حسن بصری نے جب ان کے درس میں طلبہ کا ہجوم دیکھا تو فرمایا:

لا الہ الا اللہ کادت العلماء	لا الہ الا اللہ علماء تقریباً ارباب کی
ان تکون اربابا کل عز لم یؤکد	حد تک پہونچ گئے تھے اور جس عزت
بعلم فالی ذل یؤول[1]	کی بنیاد علم پر نہ ہو اس کا انجام ذلت ہے۔

وکیع کا بیان ہے کہ ابو عمرو بن العلاء جب کوفہ آئے تو لوگ ان کے سامنے (حصول علم کے لیے) اسی طرح مجتمع ہوتے تھے جیسا کہ ہشام بن عروہ کے سامنے ہوتے تھے[2]۔

تلامذہ مدینہ منورہ، بصرہ اور کوفہ وغیرہ جہاں بھی رہے علم کی تبلیغ و اشاعت میں مسلسل مصروف رہے، ان کے بےشمار شاگردوں میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۱ [2] معرفۃ القراء ۱/۱۰۲۔

احمد بن محمد بن عبداللہ لیثی، احمد بن موسیٰ لؤلوی، ابو بحر البکراوی، اسحاق بن یوسف بن یعقوب انباری الازرق، حماد بن زید، حسین بن علی الجعفی، خارجہ بن مصعب، خالد بن جبلہ یشکری، داود بن یزید الاودی، ابو زید سعید بن اوس، سلام بن سلیمان طویل، سہیل بن یوسف، شجاع بن ابی نصر بلخی، عباس بن فضل، عبدالرحیم بن موسیٰ، عبداللہ بن داؤد حریبی، عبداللہ بن مبارک، عبدالملک بن قریب الاصمعی، عبدالوارث بن سعید تنوری، عبدالوہاب بن عطاء خفاف، عبداللہ بن معاذ، عبید بن عقیل، عدی بن فضل بن عامر ازدی، علی بن نصر جہضمی، عصمہ بن عروۃ تمیمی، عیسیٰ بن عمر ہمدانی، محبوب بن حسن محمد بن حسن، ابوجعفر رواسی، مسعود بن صالح، معاذ بن مسلم نحوی، معاذ بن معاذ، نعیم بن میسرہ، نعیم بن یحییٰ سعیدی، ہارون بن موسیٰ الاعور، یحییٰ بن مبارک یزیدی، یعلی بن عبید، یونس بن حبیب نحوی، محمد بن حسن بن ابی سارۃ اور سیبویہ وغیرہ[1]

رواۃ قرأت ان کی قرأت کی روایت مندرجہ ذیل دو اشخاص نے کی ہے۔

(۱) ابو عمرو حفص بن عمر بن عبدالعزیز صہبان دوری۔

(۲) ابوشعیب صالح بن زیاد بن عبداللہ بن اسماعیل سوسی۔

علم و فضل امام ابو عمرو اپنے عہد کے عبقری اور نابغہ شخص تھے، نضر بن شمیل نے ان کا شمار سید العلماء میں کیا ہے[2] اور ابن الندیم نے من الاعلام فی القرآن لکھا ہے[3]، امام اصمعی کو ان سے زیادہ ملاقات کا موقع ملا، ابو عمرو کی مدح و توصیف سے متعلق ان کے متعدد اقوال ملتے ہیں جن کو اختصار کے خیال سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

---

[1] معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ و غایۃ النہایہ ۱/۲۹۰ و تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۹ [2] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰

[3] ابن الندیم، الفہرست ص ۴۲ مطبع الرحمانیہ، مصر۔

علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ابو عمرو قرآن اور علوم عربیہ کے بڑے عالم تھے[1]، ابو عمرو شیبانی کا بیان ہے کہ میں نے ابو عمرو کا مثل نہیں دیکھا[2]، ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ امام ابو عمرو کے پاس (کتابوں اور عرب فصحا کے اقوال پر مشتمل) ایک دفتر تھا جو پورے گھر پر محیط تھا، جب ابو عمرو عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے تو اس کو جلا دیا اور وہ جب دوبارہ علم و فن کی طرف راغب ہوئے تو ان کے پاس حفظ کی ہوئی چیزوں کے علاوہ کچھ نہ تھا[3]، احمد بن مسعود کا بیان ہے کہ جب ابو عمرو بن العلاء گوشہ نشین تھے تو ان کے پاس مشہور شاعر فرزدق آئے اور انکی شان میں مدح و تحسین کے چند اشعار پیش کیے:۔

مازلت افتح ابوابا و اغلقها   حتی اتیت ابا عمرو بن عمار

میں نے بہت سے دروازے کھولے اور بند کیے یہاں تک کہ ابو عمرو بن عمار کی خدمت میں پہونچا۔

حتی اتیت فتی ضخما دسیعته   مر المریرۃ حرا و ابن احرار

ان کو میں نے ایک تنومند نوجوان پایا جو آزاد و اہل آزاد کے بیٹے تھے۔

ینمیهم مازن فی فرع نبعتها   جد کریم و عود غیر خوار[4]

ان کا تعلق قبیلہ مازن کی ایک ایسی شاخ سے تھا جس کا سلسلہ ایک شریف النسل سے جڑتا ہے اور وہ معزز اور شریف تھا۔

ابن مناذر نے بھی ان کی مدح کی ہے فرماتے ہیں:

سمیتم آل العلاء لانکم   اهل العلاء و معدن العلم

تمہارا نام آل علاء اس لیے رکھا گیا ہے کہ تم لوگ عالی مرتبت ہو اور علم کے خزانے ہو:

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۰ [2] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۹ [3] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۰ و علامہ ذہبی، العبر فی خبر من غبر ۱/۲۲۳، دائرۃ المطبوعات والنشر کویت ۱۹۶۰ء و ابن خلکان ۱/۵۰ [4] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴۔

ولقد بنیٰ آل العلاء لمازن | بیتا احلوا مع النجم[1]

آل علاء نے اپنے قبیلہ مازن میں ایک ایسا گھر آباد کیا ہے جس کو ستاروں سے مزین کیا ہے۔

ابوعمرو اسدی کہتے ہیں کہ میں امام ابوعمرو کے انتقال کے بعد ان کے فرزندان
کے پاس تعزیت کے لیے گیا ابھی وہیں تھا کہ یونس بن حبیب آگئے، انہوں نے فرمایا کہ
آج تک ہم نے ان کا ثانی نہیں دیکھا، اگر ان کے علم و فن اور زہد و ورع کو سو انسانوں
کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو وہ سب کے سب عالم و زاہد ہو جائیں گے اور اگر یہ
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو آپؐ ان کو ضرور ان کے درجہ و مرتبہ
کی خوش خبری دیتے[2] ابوعمرو علم و فضل کے ساتھ سنت کے بھی پابند تھے[3]

حجاج کے مظالم | حجاج کے مظالم کی وجہ سے ابوعمرو اپنے والد کے ہمراہ عراق سے
جنوبی عرب چلے آئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً بیس سال تھی، یہ لوگ ایک عرصہ
تک جنوبی عرب میں روپوشی کی زندگی گزارتے رہے، اس سفر کی وجہ سے غالباً
ابوعمرو کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں قرأت کی ترویج کا موقع ملا اور یہ سلسلہ بظاہر
۹۵ھ/۷۱۴ء حجاج کی وفات تک جاری رہا، اس کی وفات کے بعد ابوعمرو اور انکے والد
عراق واپس آئے، لیکن ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ ابوعمرو نے خود مجھ سے بیان کیا کہ مجھے اور
میرے والد کو حجاج بن یوسف نے طلب کیا تو ہم اس کے خوف سے یمن کی طرف نکل
بھاگے مگر راستہ ہی میں ایک شخص کو یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا

لاتضیق بالامور فقد تف | رج غماؤھا بغیر احتیال

---

[1] روضات الجنات ۴/۳۲۳ [2] غایۃ النہایۃ ۱/۲۹۲ [3] ایضاً ۱/۲۸۹ [4] ابن خلکان ۲/۱۰۶

[5] معرفۃ القراء ۱/۱۰۳۔

معاملات سے تنگ دل نہ ہو کیونکہ پریشان حالی کا خاتمہ بغیر کسی کوشش کے خود بخود ہو گیا۔

رب ماتکرہ النفوس من الامر | لہا فرجۃ کفرج العقال

کتنے ایسے ناپسندیدہ معاملات ہوا کرتے ہیں جو نفس پر گراں گزرتے ہیں مگر ان کا
راستہ اسی طرح نظر آتا ہے جیسے اونٹ اپنی رسی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

میرے والد نے اس سے دریافت کیا کہ معاملہ کیا ہے، اس نے بتایا کہ حجاج کا
انتقال ہو گیا یہ سن کر ہمیں محسوس ہوا کہ ہم غموں سے نجات پاگئے[1] چنانچہ بصرہ
واپس لوٹ آئے۔

امرا کے دربار میں رسوخ | اپنے علم و فضل اور زہد و اتقا کی وجہ سے انہیں بڑی شہرت
و مقبولیت نصیب ہوئی اور عوام کے علاوہ ارباب حکومت میں بھی وہ باریاب ہو گئے
تھے، خلیفہ السفاح کے چچا سلیمان سے اور خلیفہ مہدی کے چچا یزیدی سے نیز شام کے
حاکم عبدالوہاب سے ان کے اچھے مراسم و تعلقات تھے، عبدالوہاب سے ملاقات کر کے
آئے تھے کہ انکا انتقال ہوا۔

فن قرأت میں علوئے مرتبت | امام ابوعمرو کا درجہ فن قرأت میں بہت بلند ہے انہوں نے
تابعین کی ایک جماعت سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی علم قرأت کے حصول میں
خاص طور پر بڑی سعی کی اور قرأت قرآن میں ایک طرز خاص کے موجد و امام ہوئے خود
ان کا بیان ہے کہ میں نے قرآن پاک کا ایک حرف بھی بغیر نقل و اثر کے اپنی رائے سے
نہیں پڑھا[2] امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ ابوعمرو کی قرأت میری پسندیدہ ہے[3]
وہ ان کی قرأت کو قریش اور فصحا کی قرأت کہتے ہیں[4] امام اصمعی کا بیان ہے کہ ابوعمرو اپنے

---

[1] غایۃ النہایۃ ۱/۲۹۱ [2] ابن خلکان ۱/۱۰۶ [3] ملا علی قاری؛ شرح شاطبی ص ۱۳ [4] ایضاً [5] حافظ ابو
شامۃ ابراز المعانی ص ۵۔

شیخ سلطان الاولیا حسن بصری کی زندگی ہی میں سیادت کے مرتبہ پر پہونچ گئے تھے۔ اور اپنے عہد میں سب پر فائق و برتر تھے[1] اہل مدینہ اسے قاری ہی تسلیم نہ کرتے تھے جس نے ابوعمرو سے اخذ قرأت نہ کیا ہو، خود امام ابوعمرو کا بیان ہے کہ مجھے اس علم سے بہت کم سنی ہی سے دلچسپی تھی اور اب میری عمر ۸۴ سال ہے[2]

سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بہت سی قرأتیں رائج ہیں، میں کس کی قرأت پڑھوں، آپؐ نے فرمایا ابوعمرو بن العلاء کی قرأت اختیار کرو[3]

شجاع بن ابونصر کا بیان ہے میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی تو میں نے آپؐ کی خدمت میں ابوعمرو بن العلاء کی قرأت سے متعلق کئی چیزوں کو پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے دو حرفوں کے کسی کو رد نہیں فرمایا، پہلی آیت وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (۲-۱۲۸) اور دوسری آیت مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا (۲-۱۰۶) ہے[4]

نصر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ آپ کا عمل کس قرأت پر ہے تو انھوں نے فرمایا کہ ابوعمرو بن العلاء کی قرأت پر[5]

شعبہ کا بیان ہے کہ ابوعمرو بن العلاء کی قرأت کو مضبوطی سے پکڑ لو کیونکہ یہ لوگوں کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے[6] وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ جو پڑھتے ہیں اس پر توجہ

---

[1] معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ [2] ابن خلکان ۲/۱۰۵ [3] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۱ و معرفۃ القراء ۱/۱۰۲ و بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۳۱ [4] غایۃ النہایہ و معرفۃ القراء ۱/۱۰۲ [5] ایضاً [6] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۱ و معرفۃ القراء ۱/۱۰۲ [7] ایضاً ۱/۲۹۱۔

کیونکہ یہ لوگوں کے لیے سند بننے والی ہے[1] علامہ ابن الجزری نے شعبہ کے اقوال پر مفصل تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

"شعبہ کی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ شام، حجاز، یمن اور مصر میں لوگوں کے درمیان امام ابوعمرو ہی کی قرأت رائج ہے، ان ممالک میں ایک بھی شخص نہ ملے گا جو ان کی قرأت کے علاوہ کسی اور قرأت کی تعلیم دیتا ہو خاص طور پر فرش میں ہاں اصول کے اندر لوگ غلطی کرتے ہیں اور شام کے لوگ امام ابن عامر کی قرأت کے مطابق پڑھتے تھے مگر ایک شخص نے جامع الاموی میں بیٹھ کر لوگوں کو امام ابوعمرو کی قرأت کی تعلیم دینا شروع کیا اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا یہانتک کہ ابوعمرو کی قرأت لوگوں میں مشہور ہوگئی[2]"

علامہ دانیؒ فرماتے ہیں:۔

والیہ انتہت الامامۃ فی القرأۃ بالبصرۃ[3]	بصرہ میں امام ابوعمرو پر امامت قرأت ختم ہوگئی۔

یزید کا بیان ہے کہ:

کان ابوعمرو وقد عرف القرأت	ابوعمرو عارف قرأت، تمام قرأتوں
فقرأ من کل قرأۃ باحسنھا	کے ماہر اور ہر اس قرأت کو احسن
وبما یختار العرب وبما بلغہ	طریقے سے پڑھتے تھے جس کو اہل عرب
النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اختیار کرتے ہیں اور اس لغت
وجاء تصدیقۃ فی کتاب اللہ	کو پڑھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۲ [2] ایضاً [3] معرفۃ القراء ۱/۱۰۱۔

عزوجل [1]	کی لغت ہے اور جس کی تصدیق کتاب اللہ نے کی ہے۔

خود ابوعمرو بن العلاء کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر نے میری قرات سن کر فرمایا کہ تم اسی قرأت پر مضبوطی سے عمل کرو۔[2] ابوبکر بن مجاہد فرماتے ہیں کہ:

وکان فی عصرہ بالبصرۃ جماعۃ	ان کے زمانہ میں بصرہ میں قرات
من اھل العلم بالقرأۃ	کے عالموں کی پوری جماعت تھی لیکن،
لم یبلغوا مبلغہ والی قرآتہ	ان میں سے کوئی ان کی ہمسر نہ تھی اہل
صار اھل البصرۃ او اکثرھم۔[3]	بصرہ یا ان کی اکثریت ابوعمرو کی قرات پر عمل کرتی تھی۔

حدیث امام ابوعمرو کا شمار محدثین میں بھی ہوتا ہے، انہوں نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق اپنے والد اور انس بن مالک، عطاء بن ابی رباح، ابوصالح السمان ایاس، حسن بصری، ابن سیرین، نافع مولی ابن عمر، بدیل بن میسرہ، فرقد سبخی، مجاہد اور ابورجاء العطاردی سے احادیث روایت کیں[4] اور خود ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بھائی معاذ بن العلاء، شعبہ، حماد بن زید، شریک نخعی، معمر ابن راشد، وکیع، ہارون بن موسیٰ نحوی، اصمعی، عبید بن عقیل، شبابہ، ابواسامہ اور ابوزید سعید بن اوس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں[5] لیکن علامہ ذہبی کا قول ہے کہ کتب حدیث میں انکے واسطے سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے[6] اور اس کی وجہ ان ہی کے الفاظ میں

---

[1] معرفۃ القراء ۱/۱۰۲ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ [4] ایضاً ۱۲/۱۷۹ و غایۃ النہایۃ ۱/۲۸۹ و معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ و العبر فی خبر من غبر ۱/۲۲۳ [5] ابن خلکان ۲/۱۰۵ [6] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴

یہ ہے کہ وہ حدیث میں قلیل الروایۃ تھے[1]

ثقاہت و عدالت ابوعمرو ثقہ صادق اور ضابط تھے[2]، علامہ ابن حجر عسقلانی نے ان کا شمار تابعین کے پانچویں طبقہ میں کرتے ہوئے ثقۃ من علماء العربیۃ لکھا ہے[3] جرح و تعدیل کے امام ابن معین کا بیان ہے کہ ابوعمرو ثقہ تھے[4] ابوحاتم نے لا بأس بہ کہا ہے[5] علامہ ذہبی فرماتے ہیں:-

وھو صدوق حجۃ فی القرأۃ[6]	ابوعمرو صدوق اور فن قرأت میں حجت تھے۔

ملا علی قاری کا بیان ہے کہ ابوعمرو ثقہ عادل، زاہد اور سچے تھے[7]، ابن حبان نے ان کا ذکر کتاب الثقات میں کیا ہے[8] ابوعبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں:-

وکان صدوقا مامونا[9]	ابوعمرو سچے اور قابل اطمینان تھے۔

گو انکی ثقاہت میں کلام نہیں کیا گیا ہے تاہم وہ کبار حفاظ کے ہم پایہ نہ تھے، اسی لیے ابوخیثمہ نے کہا ہے:

کان ابوعمرو بن العلاء رجلا لا باس بہ ولکنہ لم یحفظ[10]	ابوعمرو ایسے شخص تھے جن میں کوئی حرج نہیں تھا مگر وہ درجہ حفظ میں نہیں تھے۔

---

[1] روضات الجنات ۲/۳۹۹ و بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۶۷ [2] غایۃ النہایۃ ۱/۲۹۰ [3] ابن حجر عسقلانی، تقریب التہذیب ص ۲۶۲ مطبع مجتبائی، دہلی [4] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴ و بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۶۷ [5] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴ [6] روضات الجنات ۲/۳۹۹ و بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۶۷ [7] شرح شاطبی ص ۱۳ [8] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ [9] ایضاً [10] ایضاً ۲/۱۷۹۔

نحو امام ابوعمرو فن نحو کے امام اور بصرہ کے دبستان نحو کے گل سرسبد تھے، نحو کی تعلیم نصر بن عاصم سے حاصل کی اور خود ان سے یونس بن حبیب نحوی، خلیل بن احمد نحوی اور ابو محمد علی بن مبارک زیدی نے فن نحو کی تحصیل کی۔[1] انکا شمار نحو کے چوتھے طبقہ میں ہوتا ہے۔[2] خلیل بن احمد بصرہ کے سب سے ممتاز و مشہور عالم مانے جاتے ہیں لیکن ابوعمرو کو ان پر بھی فوقیت و برتری حاصل تھی، علاوہ ازیں وہ ان کے شاگرد بھی تھے۔[3]

نحو میں اپنے بلند مرتبہ کیوجہ سے وہ نحوی کی نسبت سے معروف ہوئے۔[4]

ابن جنی فرماتے ہیں:

کان ممن نظر وافی النحو	وہ ان لوگوں میں سے تھے جو نحو و
والتصریف وتدربوا	صرف میں اہل نظر، ماہر اور صاحب
وقاسوا۔[5]	قیاس ہیں۔

لغت و عربیت ابوعمرو بن العلاء لغت و عربیت میں بھی یگانۂ روزگار تھے، تذکرہ نگاروں نے انہیں لغت و عربیت کا امام لکھا ہے، ابن مجاہد فرماتے ہیں:

وکان مع علمہ باللغۃ وفقھہ	لغت و عربیت کے علم و معرفت
بالعربیۃ متمسکا بالآثار۔[6]	کے ساتھ وہ آثار پر عمل پیرا تھے۔

---

[1] .... نزہۃ الالباء ص ۳۰ [2] علامہ یافعی، مرآۃ الجنان ۱/ ۳۲۵ دائرۃ المعارف النظامیۃ حیدرآباد دکن ۱۳۳۷ھ [3] مولوی جمیل احمد، تذکرۃ النحاۃ ص ۳۰

[4] ابن الاثیر، اللباب فی تہذیب الانساب ۳/ ۲۱۷، مکتبۃ القدسی قاہرہ ۱۳۶۹ھ

[5] المدارس النحویۃ ص ۲۷ [6] تہذیب التہذیب ۱۲/ ۱۷۹

ابن الاثیر کا بیان ہے کہ:

امام فی القراءۃ والنحو واللغۃ۔[1]	فن قرات، نحو اور لغت کے امام تھے۔

شعر و ادب امام ابوعمرو کو شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی دور جاہلیت کے شعراء کے بہت سے اشعار ان کو یاد تھے اور وہ انہیں برمحل اور بہ موقع استعمال بھی کرتے تھے، اشعار ان لوگوں کے حوالے سے نقل کرتے جن لوگوں نے دور جاہلیت کے شعراء کو دیکھا تھا۔[2] امام اصمعی کا بیان ہے کہ میں ابوعمرو کے پاس دس سال تک رہا مگر میں نے ان کی زبان سے کبھی دور اسلام کے کسی شاعر کا شعر نہیں سنا۔[3] میں نے ابوعمرو سے ہزار مسئلے دریافت کیے ابوعمرو نے ہر مسئلہ کا مدلل جواب دیا جس کے ثبوت میں شعرائے جاہلیت کا کلام بھی پیش کیا۔[4] ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ ابوعمرو بن العلاء السفاح کے چچا سلیمان علی کے پاس گئے تو اس نے کسی چیز کے بارے میں اس سے سوال کیا، اس نے جواب دیا وہ اسے پسند نہیں آیا، ابوعمرو کو اس کا احساس ہوگیا اس لیے اس نے یہ شعر پڑھا ؎

انفت من الذل عند الملوک	وان اکرمونی وان قربوا

میں نے بادشاہوں کے پاس ذلت ہی محسوس کی اگرچہ وہ میری عزت کریں اور مجھے قربت بخشیں۔

اذا ما صدقتھم خفتھم	ویرضون منی بأن یکذبوا[5]

جب میں ان کی تصدیق کرتا ہوں تب بھی ان سے ڈرتا ہوں جبکہ وہ مجھ سے اس پر راضی ہوتے ہیں کہ ان کی تکذیب کی جائے۔

---

[1] اللباب ۳/ ۲۱۷ [2] الاعلام ۳/ ۴۱ [3] ابن خلکان ۲/ ۱۰۶ [4] مرآۃ الجنان ۱/ ۳۲۵ [5] ابن خلکان ۲/ ۱۰۷۔

اصمعی کا بیان ہے کہ وہ رمضان المبارک میں کبھی شعر نہیں پڑھتے تھے[۱]

جامعیت | ان کی جامعیت کا اندازہ مندرجہ ذیل اقوال سے ہوگا، صاحب تذکرة النحاة لکھتے ہیں:

در علم قرآن و عربیت و اشعار عرب یگانہ روزگار بود[۲]

علم قرآن و عربیت اور اشعار عرب میں یگانۂ روزگار تھے۔

علامہ سیوطی اور باقر موسوی لکھتے ہیں:

کان امام اهل البصرة فی القرأة والنحو واللغة[۳]

ابوعمرو قرآت عربیت لغت میں اہل بصرہ کے امام تھے۔

ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ:

کان ابوعمرو اعلم الناس بالقرآن والعربیة وایام العرب والشعر وایام الناس[۴]

ابوعمرو فن قرآت نحو اور ایام عرب شعر اور ایام الناس کے اعلم الناس تھے۔

ابوبکر ابن مجاہد کا قول ہے:

کان ابوعمرو مقدما فی عصره عالما بالقراة ووجوهها قدوة فی العلم واللغة امام الناس فی العربیة[۵]

ابوعمرو اپنے زمانہ میں فائق و مقدم تھے جو فن قرات اور اس کے مختلف وجوہ سے واقف اور علم و لغت میں ایک مثالی نمونہ اور عربیت میں

۱؎ ابن خلکان ص ۱۰۶، ۲؎ تذکرة النحاة ص ۳ ۳؎ بغیة الوعاة ۲/۲۶۷ وروضات الجنات ۲/۳۹۹ ۴؎ معرفة القراء ۱/۱۰۳ ۵؎ تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۹۔

لوگوں کے امام تھے۔

ابومعاویہ الازہری فرماتے ہیں:

کان من اعلم الناس بوجوه القراأت والفاظ العرب و نوادر کلامهم وفصیح اشعارهم[۱]

قرات کے وجوہ، عرب کے الفاظ، انکے نوادر کلام اور فصیح اشعار کے سب سے بڑے عالم تھے۔

جاحظ کا قول ہے کہ:

کان اعلم الناس بالغریب والعربیة وبالقرآن والشعر وبایام العرب وایام الناس[۲]

غریب الفاظ، عربیت، قرآن، شعر، ایام عرب اور ایام الناس کے سب سے بڑے عالم تھے۔

کرامات | ابوعمرو کے بعض خوارق و کرامات بھی بیان کیے گئے ہیں، عبدالوارث کا بیان ہے کہ ایک سال میں ان کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوا، ایک دن راستے میں ایک چٹیل میدان میں ہمیں بٹھایا اور خود کہیں چلے گئے یہ تاکید بھی کر گئے تھے کہ میری واپسی تک یہاں سے کہیں نہ جانا لیکن جب بہت دیر ہوگئی تو میں ان کی تلاش میں نکلا اچانک میری نظر ان پر پڑی دیکھا کہ وہ اس بے آب و گیاہ سرزمین میں ایک چشمہ پر وضو کر رہے ہیں یہ راز فاش ہو جانے پر انہوں نے مجھ کو تلقین فرمائی کہ اسے کسی سے بیان مت کرنا، میں نے اس کا عہد کیا، خدا کی قسم ان کی زندگی بھر اس کا کسی سے ذکر نہیں کیا[۳]

تصانیف | ان کی پوری زندگی تعلیم و تدریس میں بسر ہوئی مگر انہیں تحریر و تصنیف

۱؎ تہذیب التہذیب ص ۱۸۰ ۲؎ المدارس النحویة ص ۲۷ ۳؎ غایة النہایة ۱/۲۹۱۔

سے بھی شغف تھا، ابن الندیم نے انکی دو کتابوں کتاب النوادر[۱] اور کتاب القرأت کا ذکر کیا ہے[۲] ان کی نظر سے ان کے بعض مخطوطات گزرے تھے[۳] انکا بیان ہے کہ کتاب النوادر[۴] کا ایک نسخہ جو ابوعمرو نے چھوڑا تھا بعینہ باقی ہے[۵]

متعدد اہل فن نے ان پر کتابیں لکھی ہیں مثلاً احمد بن یزید الحلوانی کی کتاب قراۃ ابی عمرو اور ابو دہل کی تصنیف کتاب قرأۃ ابی عمرو بن العلاء وغیرہ[۶]

اقوال زریں | ابوعمرو بن العلاء سے بعض زریں اقوال منقول ہیں، مثلاً امام اصمعی کا بیان[۱۰] ہے کہ میں نے ابوعمرو کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ اہل خیر سے خیر لے لو اور اہل شر کے لیے شر چھوڑ دو[۱۱]۔ ابن مناذر کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ حصول علم کی مدت کیا ہے فرمایا زندگی بھر[۱۲]۔ نیز فرماتے ہیں:

اول العلم الصمت ثم حسن السوال	خاموشی اولین علم ہے پھر عمدہ سوال
ثم حسن اللفظ ثم نشرہ عند	کرنا پھر الفاظ کا حسن پھر لائق و اہل
اھلہ وقال احتمال الحاجۃ	لوگوں میں اسکی اشاعت ہے اور فرمایا
خیر من طلبھا من غیر اھلھا	کہ ضرورت مند رہ جانا اس سے بہتر ہے
قال وما تساب اثنان الاغلب	کہ نا اہل لوگوں سے حاجت روائی کی
الامھا وقال اذا تمکن الاخاء	درخواست کی جائے، دو گالی گلوج
قبح الثناء وما ضاق مجلس بمتحابین	کرنے والوں میں جو زیادہ کمینہ ہے

[۱] الفہرست ص ۴۱ بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ ۱/۸۷۰ [۲] الفہرست ص ۵۳ مطبع الرحمانیہ مصر [۳] الفہرست ص ۴۱ بحوالہ دائرۂ معارف اسلامیہ ۱/۸۷۰ [۴] ایضاً [۵] الفہرست ص ۴۴ [۶] معرفۃ القراء ۱/۱۰۲ [۷] ابن خلکان ۲/۱۰۶۔

وما اتسعت الدنیا لمتباغضین[۱]	وہی غالب آتا ہے، دوستی جب پختہ ہوتی ہے تو (رسمی) تعریف بری لگتی ہے، دو آپس میں محبت کرنے والوں کے لیے کوئی مجلس تنگ نہیں ہوتی لیکن نفرت کرنے والوں کے لیے دنیا بھی تنگ ہو جاتی ہے۔

انتقال | امام ابوعمرو بصری نے ۱۵۴ھ میں عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ میں ۸۶ برس کی عمر میں کوفہ میں انتقال کیا[۲] بعض لوگوں کا بیان ہے کہ انکا انتقال شام کے راستے میں ہوا[۳] ابن خلکان اور دوسرے تذکرہ نگاروں کے مطابق یہ گورنر شام عبدالوہاب بن ابراہیم سے ملاقات کر کے آئے تھے کہ کوفہ میں انتقال ہوا[۴] کوفہ میں ان کی قبر پر یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ ابوعمرو بن العلاء مولیٰ بنو حنیفہ کی قبر ہے[۵]

گو وفات کے متعلق متعدد اقوال ہیں، مگر اکثر لوگوں کے نزدیک انکی وفات ۱۵۴ھ میں ہوئی۔ انکی وفات پر عبداللہ بن مقفع نے مرثیہ لکھا تھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

رزئنا ابا عمرو ولا حی مثلہ	فللہ ریب الحادثات بمن وقع
فان تک قد فارقتنا وترکتنا	ذوی خلۃ ما فی انسداد لھا طمع
فقد جر نفعا فقدنا لک اننا	امنا علی کل الرزایا من الجزع

یہ اشعار دوسروں سے بھی منسوب کیے گئے ہیں مگر صحیح قول کے مطابق یہ ابن مقفع ہی کے اشعار ہیں۔

[۱] شذرات الذہب ۱/۲۳۸ [۲] معرفۃ القراء ۱/۱۰۵ و غایۃ النہایہ ۱/۲۹۲ و نزہۃ الالباء ص ۳۸ و تقریب التہذیب ص ۴۶۲ [۳] المعارف ص ۵۴۰ و تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ و الاعلام ۳/۴۱ و ابن خلکان ۲/۱۰۸ [۴] ابن خلکان ۲/۱۰۷ و المعارف ص ۵۴۰ و شذرات الذہب ۱/۲۳۸ [۵] معرفۃ القراء ۱/۱۰۵ [۶] غایۃ النہایہ ۱/

اقبال کے کلام میں "قیصر" کی اصطلاح

جناب محمد بدیع الزماں صاحب

اقبال نے اپنے پیام رسانی کی پوری عمارت خود اپنی وضع کردہ اصطلاحوں پر کھڑی کی ہے، پہلے وہ اگلوں کی طرح طائر زیر دام نہیں بلکہ بہت اونچی سطح پر کھڑے طائر زیر بام تھے۔ اس کی ضرورت انہیں اس لیے بھی لاحق ہوئی کہ روایتی علامات واصطلاحات کثرت استعمال سے ایک تو اپنا حسن کھو چکی تھیں دوسرے وہ اقبال کے پیام کا بوجھ اٹھانے کی مطلق متحمل نہ تھیں۔ اگر انہوں نے روایتی علامات واصطلاحات کو اپنے کلام میں استعمال بھی کیا تو ان کے معنی اس طرح بدل دیے جن سے اردو شاعری قطعی طور پر ناآشنا تھی۔

اقبال کے کلام میں خود ان کی وضع کردہ اصطلاحات کی تعداد پانچ سو سے بھی زائد ہے، جن میں نام سے منسوب ۱۰۵ اصطلاحیں ہیں، جغرافیائی اصطلاحات کی تعداد ۶۵ ہے، قرآنی تلمیحات کی تعداد سو سے بھی زائد ہے اور الفاظ سے مشتق اصطلاحوں کی تعداد کی کوئی گنتی نہیں مگر کلام میں زیادہ مستعمل ایسی اصطلاحیں قریب دو سو ہیں۔

اقبال کا مقصود ان ساری اصطلاحوں سے خواہ وہ نام سے منسوب ہوں یا جغرافیہ سے، قرآنی تلمیحات ہوں یا الفاظ سے مشتق، اگر ایک طرف اسلامی تاریخ کے پس منظر میں

اسلاف کے کارناموں کی یاد دلانی ہے تو دوسری طرف ان اصطلاحوں سے مسلمانوں میں وہی جذبۂ ایمانی اور جوشِ کردار کی ترغیب دینی ہے جو ان اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا اور جن اوصاف نے انہیں تختِ فغفوری اور سریرِ کے عطا کیا۔

نام سے منسوب ایسی ہی ایک اصطلاح "قیصر" ہے جس سے انہوں نے دو اور اصطلاحیں "قیصری" اور "سیزر" وضع کی اور جو اس مضمون کے موضوع ہیں۔ مگر ان اصطلاحات سے ترتیب دیے گئے اشعار کو گرفت میں لانے کے لیے ہمیں اس پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے جس پس منظر میں مسلمانوں کو رومی سلطنت سے واسطہ پڑا۔

"قیصر" عجمی زبان کا لفظ ہے اور عجمیوں نے رومی سلطنت کے ہر بادشاہ کو اسی لقب سے یاد کیا ہے حالانکہ ان کے نام الگ الگ تھے۔ انگریزی زبان میں "قیصر" کو "سیزر" کہتے ہیں۔ رومی سلطنت ۲۷ ق۔م۔ میں آگسٹس نے قائم کی تھی جسے تاریخ میں "ہولی رومن امپائر" کہتے ہیں۔ مگر اس سلطنت کا خاتمہ ۴۷۶ء میں جرمن قبائلیوں نے کر دیا۔ رومی سلطنت قائم ہونے کے چند سالوں قبل تک روم ایک جمہوریہ تھا مگر جولیس سیزر (۴۴-۱۰۰ ق۔م) اس کا مطلق العنان ڈکٹیٹر اور بادشاہ بن بیٹھا۔ سیزر کی اصطلاح انگریزی لغت میں ایک مطلق العنان اور جابر بادشاہ ہی کے معنوں میں آتی ہے۔ سیزر کی پیدائش چونکہ ماں کا پیٹ چاک کرکے ہوئی تھی اس لیے آج بھی ماں کا پیٹ چاک کر کے بچہ پیدا کرنے کے طریقہ کو مغربی علم طب "ہسٹروٹومی" کو "سیزارین آپریشن" کا نام دیا جاتا ہے۔

سیزر کے بعد رومی جرنلوں میں عرصہ تک خانہ جنگی چلتی رہی۔ رومی بادشاہ

کونسٹین ٹائن اول نے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں اپنے نام پر شہر قسطنطنیہ آباد کیا اور اسے رومی سلطنت کا پایۂ تخت قرار دیا۔ اسی قسطنطنیہ کو موجودہ زمانہ میں موجودہ ترکی کا ایک مشہور شہر استنبول کہتے ہیں۔ ۳۹۳ء میں رومی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ اس سلطنت کے مغربی حصہ پر جس میں یورپ کے بہت سارے علاقے شامل تھے، روم سے حکومت کی جانے لگی اور مشرقی حصہ پر جس میں مغربی وسطی اور شمالی افریقہ کے علاقے شامل تھے، قسطنطنیہ سے حکومت کی جانے لگی۔ مسلمانوں کا واسطہ ان دونوں رومی سلطنتوں سے پڑا اور تاریخ اسلام ان ہی دونوں سے لڑی گئی جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ آج نہر سویز سے جبرالٹر تک بحیرۂ روم کے دونوں جانب اسلامی ملکوں کا ایک وسیع و عریض خطہ نقشہ پر جو نظر آتا ہے یہ مسلمان جانبازوں نے انہی دونوں رومی سلطنت کو شکست دے کر فتح کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات ہی میں ایرانی اور رومی دو سب سے بڑی حکومتیں تسلیم کی جاتی تھیں اور یہ دونوں اسلام کی فتوحات کو بڑی تشویش کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ ایرانی سلطنت کا علاقہ چھوٹا تھا مگر رومی نہر سوئز سے جبرالٹر تک حکمراں تھے۔ اقبال جب "قیصر" کی اصطلاح لاتے ہیں تو وہ رومی سلطنت کے اس وسیع و عریض علاقہ پر مسلمانوں کے فتوحات کی یاد دلا کر جذبۂ ایمانی اور جوشِ کردار کی یاد دلاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ: "تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو"۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ ہی سے ان دونوں سلطنتوں پر یلغار شروع ہو گئی تھی۔ رومیوں کے خلاف شام پر اسامہ بن زیدؓ کا حملہ اور حضرت خالدؓ بن ولید کا رومیوں کو اجنادین میں شکست دے کر دمشق میں فاتحانہ داخلہ، ملک شام میں حضرت ابو عبیدہؓ

کے ہاتھوں یرموک کے مقام ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ء میں رومیوں کا شکست فاش (جس فتح پر "بانگ درا" کی نظم "جنگ یرموک کا ایک واقعہ" ہے) اور پھر ۱۶ھ مطابق ۶۳۷ء میں بیت المقدس کی فتح اور حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں مصر اور اسکندریہ پر ۲۶ھ مطابق ۶۴۶ء میں قبضہ اور پھر جزیرۂ قبرص اور روڈس کے فتوحات پھر خلافت بنی امیہ کے دور میں ۱۳۶ھ مطابق ۷۵۶ء میں عبدالرحمٰن بن معاویہ کا اسپین میں خود مختار اور آزاد اسلامی حکومت کا قیام اور بعد میں پورے شمالی افریقہ پر قبضہ۔ یہ ہیں وہ سارے پس منظر جن سے ہم اقبال کی اصطلاح "قیصر" کو گرفت میں لا سکتے ہیں۔ اقبال کے ایسے اشعار میں "قیصر" سے مراد رومی سلطنت ہے خواہ وہ مغربی رومی سلطنت ہو یا مشرقی رومی سلطنت جن کا پایہ تخت علی الترتیب روم اور قسطنطنیہ تھا۔ اسلامی تاریخ کے اس پس منظر میں اب اس اصطلاح کو گرفت میں لانا آسان ہے۔

قیصر: اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کچھ درج ذیل اشعار ہیں جو علی الترتیب "بانگ درا" کی نظمیں "صبح کا ستارہ"، "بلاد اسلامیہ"، "شکوہ" اور "طلوع اسلام" اور "بالِ جبریل" کی غزل ۱ (اول) کے آخری دونوں اشعار ہیں:-

ہے چمکنے میں مزا حسن کا زیور بن کر — زینتِ تاجِ سرِ بانوئے قیصر بن کر

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار — مہدیِ امت کی سطوت کا نشانِ پائدار

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟ — شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی — وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

پہلے شعر میں "بانوئے قیصر" سے مراد کسی عظیم سلطنت کی ملکہ ہے، اقبال نے سلطنت کی زینت کو "زینتِ تاج بانوئے قیصر" کہہ کر استعارے کی بہترین مثال پیش کی ہے۔

دوسرے شعر میں "قیصر کا دیار" سے مراد قسطنطنیہ ہے جو مشرقی رومی سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ اس شہر کو ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے عثمانی شہنشاہ سلطان محمد دوم کی قیادت میں فتح کر کے اس خطے سے رومی حکومت ختم کر کے سلطنتِ عثمانیہ ترکیہ کا صدر بنا لیا اور یہ اس اسلامی حکومت کا دارالخلافہ بن گیا، جنھوں نے اس کا نام بدل کر استنبول رکھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے جو ۱۹۲۲ء میں ترکی میں برسرِ اقتدار آیا اس نے دارالخلافہ استنبول سے انقرہ منتقل کر دیا جو آج بھی ہے۔

تیسرے شعر میں "قیصر" کی اصطلاح کے ساتھ اقبال کی ایک جغرافیائی اصطلاح "خیبر" بھی آگئی اور جیسا میں نے کہا اقبال کی کوئی اصطلاح نہیں جس کا تعلق دینِ اسلام یا اسلامی تاریخ سے نہ ہو۔ خیبر یا درِ خیبر سے مراد وہ درۂ خیبر نہیں جو پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر پاکستان کے شہر پشاور اور افغانستان کی سرحد پار کر کے افغانستان کے شہر جلال آباد جاتی ہے۔ اقبال جس درِ خیبر کا ذکر کر رہے ہیں وہ خیبر مدینہ منورہ سے تقریباً دو سو میل کے فاصلہ پر ہے جو زمانۂ دراز سے یہودیوں کا مرکز تھا۔ یہاں ساتویں ہجری میں رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں اسلام کی ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی۔ یہودیوں نے بیس ہزار کی فوج جمع کی مگر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف سولہ سو جاں نثار تھے۔ یہودیوں کو کھلے میدان میں مسلمانوں سے لڑنے کی ہمت نہ تھی، اس لیے انھوں نے مقابلہ کے لیے سات قلعے بنا رکھے تھے جن میں ایک قلعہ قموص نام کا تھا اور ان ہی سات میں بیس ہزار فوج

رکھی گئی تھی۔ جب مسلمانوں کے ہاتھوں جنگ میں چھ قلعے فتح ہو چکے تو قلعہ قموص، جس کا سردار مرحب تھا، جنگ میں کود پڑا جس کا مقابلہ حضرت علیؓ نے کیا اور قلعہ کے پھاٹک کو توڑ ڈالا۔ راویوں کا بیان ہے کہ جس پھاٹک کو ساٹھ ستر آدمی اٹھا سکتے تھے اسے حضرت علیؓ نے اکیلے اٹھا لیا۔ یہ تھا "بازوئے حیدر" جسے اقبال نے چوتھے شعر میں "زورِ حیدر" سے موسوم کیا ہے اور "بالِ جبریل" کی ایک رباعی میں اسے "بازوئے حیدر" کا نام دیتے ہوئے مسلمانوں کے لیے خدا سے دعا کی ہے کہ ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

حضرت علیؓ کے عشقِ رسول میں خیبر کی اس جنگ میں گرویدگی پر اقبال نے "بالِ جبریل" ہی کی ایک رباعی میں عشقِ رسول میں اس گرویدگی کو "خیبر شکن عشق" سے تعبیر کرتے ہوئے عشقِ رسول میں گرویدگی کی ایک علامت یہ بتائی ہے کہ ؎

کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اقبال کے یہاں نام سے منسوب اصطلاحوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ایک حضرت علی کے لقب "حیدر" سے اقبال نے "حیدر"، "حیدرِ کرار"، "کراری" اور "حیدری" اور "اسدی" سے "اسد اللّٰہی" وضع کی جن سے علی الترتیب کلام میں تین، دو، .... پانچ اور تین اشعار ہیں جب کہ حضرت علی سے بہ طور اصطلاح تین اشعار الگ ہیں۔ خیبر کی اس جنگ کے پس منظر میں اقبال نے یہودی مرحب کے نام سے منسوب "مرحبی" اور ان کے بھائی "عنتری" کی اصطلاحیں وضع کر کے مسلمانوں کو کفر پر غالب آنے کی تلقین "بانگِ درا" کی نظم "میں اور تو" (بعد از نظم "شکسپیئر") میں اس طرح کی ہے ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

"خیبر" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں دو ہی اشعار ہیں۔ دوسرا شعر "بالِ جبریل"
کی غزل ۳۰ کا ہے:

قیصر کی اصطلاح کے زیرِ تجزیہ تیسرے شعر میں "شہرِ قیصر" سے مراد قسطنطنیہ ہے۔

چوتھے شعر میں "قیصر" سے مراد مغربی اور مشرقی دونوں رومی سلطنتیں ہیں جن کے
استبداد کو اسلام کے فدائیوں نے ختم کر کے نہر سوئز سے جبرالٹر تک بحیرۂ روم کے
دونوں جانب اسلامی ریاستیں قائم کیں۔ اس شعر میں نام سے منسوب اقبال کی ایک
اور اصطلاح "کسریٰ" ہے۔ جو ترجمان ہے ایرانی سلطنت کا۔ جیسا مضمون کے شروع
میں کہا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اور اس کے بعد اس وقت دنیا کی
یہی دو بڑی سلطنتیں ایرانیوں اور رومیوں کی تھیں جن سے مسلمانوں کو ٹکر لینی پڑی۔ "کسریٰ"
کی اصطلاح معرب ہے، خسرو کا لقب نوشیرواں بادشاہ کا خصوصاً اور یہ لقب تھا
شاہانِ فارس اور مدائن کا۔ اس کی جمع اکاسرہ آتی ہے۔ کیخسرو اور کسریٰ ایک ہی بادشاہ
کا لقب تھا۔ "کسریٰ" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ خسرو سے
اقبال نے دو اصطلاحیں وضع کیں۔ ایک "خسروانہ" جس سے کلام میں صرف ایک
شعر ہے اور دوسری "خسروی" جس سے دو اشعار ہیں۔ مگر اقبال نے "کیخسرو" سے
"کے" کی اصطلاح وضع کی جس سے تین اشعار ہیں۔ اس شعر میں کسریٰ کی ہٹنے
کی بات لا کر اقبال نے حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں حضرت خالدؓ بن ولید
کا ۱۲ھ مطابق ۶۳۳ء میں عراق پر قبضہ جو سلطنت ایران کا صوبہ تھا، پھر ابو عبیدہ
ثقفی اور مثنیٰ بن حارثہ کا ایک سال بعد دریائے فرات کے کنارے بویب کے مقام
پر ایرانیوں سے لڑی گئی جنگ، پھر سعد بن وقاص کی قادسیہ میں فتح اور آخر میں شاہ ایران

یزدجرد کی دار السلطنت مدائن میں شکست کے بعد ۱۶ھ مطابق ۶۳۷ء میں پوری
ایرانی سلطنت پر مسلمانوں کے قبضے کی یاد دلائی ہے اور یہی نام سے منسوب اصطلاح
کو لانے کا اقبال کا مقصود ہے۔

پانچویں شعر میں "ہلاکِ قیصر و کسریٰ" سے عظیم سلطنتوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں
خاتمہ مراد ہے اور چھٹے شعر میں "آستانِ قیصر و کسریٰ" سے مراد دنیوی جاہ و جلال و
شان و شوکت ہے، اس شعر میں "خویشتن بینی" سے مراد اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا ہے
اور "خویشتن داری" سے مراد اپنی خودی کی حفاظت کرنی اور اس میں استغنا کا
رنگ پیدا کرنا ہے۔

قیصری: اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین درج ذیل اشعار
ہیں جو علی الترتیب "بانگِ درا" کی نظمیں "گورستانِ شاہی"، "خضرِ راہ"۔ "سلطنت" اور
"بالِ جبریل" کی غزل ۲۵ کے ہیں:

رعبِ فغفوری ہو دنیا میں، کہ شانِ قیصری — ٹل نہیں سکتا غنیم موت کی یورش کبھی
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے — خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

پہلے شعر میں "شانِ قیصری" سے مراد دنیوی شان و شوکت و جاہ و جلال ہے۔ اس
شعر میں نام سے منسوب اقبال کی ایک اصطلاح "فغفوری" بھی ہے۔ فغفور فارسی
لفظ ہے۔ یہ ایک بادشاہ چین کا نام تھا۔ فغفور اصل میں فغپور تھا۔ فغ بمعنی بت
اور پور بمعنی پسر۔ چونکہ اس کے والدین نے اسے بت کی نذر کر دیا تھا اس لیے اس کا
یہ نام ہوا۔ مگر چین کے بادشاہ کا لقب خاقان تھا جو اقبال کے یہاں ایک اہم اصطلاح

ہے جس سے صرف ایک ہی شعر ہے۔

اقبال کے کلام میں "فغفور" الگ اصطلاح ہے جس سے کلام میں بہت اشعار ہیں مگر "فغفوری" کی اصطلاح سے کل دو اشعار ہیں۔ اس سے پہلے کے دو مصرعہ میں اقبال نے موت کے یقینی ہونے پر سورۂ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۸۵، سورۂ العنکبوت ۲۹ کی آیت ۵۷، سورۃ الجمعہ ۶۲ کی آیت ۸ اور سورۃ نوح ۷۰ کی آیت ۴ کی ترجمانی کی ہے۔

دوسرے شعر میں "نوائے قیصری" سے مغربی ممالک کی ملک گیری اور ملوکیت مراد ہے اور تیسرے شعر میں "قیصری" سے مراد وہ بادشاہی ہے جو فوج اور خزانہ کی محتاج ہو۔ اس تیسرے شعر میں نام سے منسوب اقبال کی وضع کردہ ایک اصطلاح "سکندری" بھی ہے اور "شانِ سکندری" سے مراد دنیا میں کمال حاصل کرنا مراد ہے۔ اقبال نے یونانی سپہ سالار۔ اور تاریخ کے ایک عظیم فاتح سکندر اعظم کے نام سے کئی اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ ایک "سکندر" جو بطور اصطلاح آٹھ اشعار میں ہیں، دوسری "سکندرا" جس سے صرف ایک شعر ہے، تیسری "سکندری" جس سے چھ اشعار ہیں، چوتھی "اسکندر" جس سے چار اشعار ہیں اور پانچویں "اسکندری" جس سے کل دو اشعار ہیں۔

سیزر: اس اصطلاح سے ایک ہی درج ذیل شعر ارمغانِ حجاز کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا ہے، جہاں ابلیس اپنے مشیروں کو اطمینان دلاتا ہے کہ ؂

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

اس شعر میں "آلِ سیزر" سے مراد مسولینی ہے جس نے ۱۹۲۲ء میں اٹلی میں اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر لی اور دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء - ۴۵) میں جرمنی کے ہٹلر کے ساتھ مل کر "اتحادیوں" سے جنگ کی مگر اسے خود اٹلی کے باشندوں نے اپریل ۱۹۴۵ء

میں پھانسی دے دی اور اتحادی روم پر قابض ہو گئے۔

نومبر ۱۹۳۱ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے بلائی گئی گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی میں اقبال نے اٹلی میں مسولینی سے ملاقات کی۔ دوران ملاقات جب مسولینی نے اقبال سے پوچھا کہ "میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" تو اقبال نے جواب دیا۔

"آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو سکتا ہے۔"

ایسے تو آلِ سیزر یعنی روم کے حکمرانوں کا ۱۹۱۱ء سے لیبیا پر قبضہ تھا ہی مگر متذکرہ شعر کا پس منظر مسولینی کا ۱۹۳۵ء میں ابی سینیا (موجودہ ایتھوپیا) پر غاصبانہ قبضہ ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ اقبال کے انتقال کے بعد انکی یہ پیشنگوئی اور بھی صحیح ثابت ہوئی جب مسولینی نے دوسرے مسلم ملک البانیہ پر ۱۹۳۹ء میں قبضہ کر لیا۔

اقبال کے مجموعۂ کلام "ضرب کلیم" میں ایک خصوصی نظم "مسولینی" پر اور ایک خصوصی نظم بنام "ابی سینیا" اس غاصبانہ قبضہ پر ہے جو ابلیس کے ذریعہ آلِ سیزر کو سیزر کا خواب دکھانے کی تعبیر ہے۔

وفیات

پروفیسر رشید الظفر مرحوم

گذشتہ ماہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ جامعہ ہمدرد دہلی کے لائق وائس چانسلر پروفیسر رشید الظفر کا انتقال ایک حادثہ میں ہوگیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، وہ سعودی عرب کے سفر پر تھے جہاں ریاض اور ظہران کی شاہراہ پر ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا اور اس طرح یہ سفر ان کے لیے سفر آخرت بن گیا۔

وہ مسلم یونیورسٹی کے قابل فخر طالب علم تھے، ان کے والد پروفیسر حفیظ الرحمٰن بھی اسی یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے ممتاز اساتذہ میں تھے، انہوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی، خاص مضمون اسٹرکچرل انجینئرنگ تھا، اس میں بیرون ملک کی دانشگاہوں سے بھی استفادہ کیا اور اعلیٰ سندیں حاصل کیں، معلم و متعلم کی حیثیت سے ان کی زندگی قابل رشک اور مثالی رہی، صرف ۳۱ سال کی عمر میں وہ مسلم یونیورسٹی میں سول انجینئرنگ کے پروفیسر ہوگئے، بعد میں انہوں نے اس موضوع پر بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل کی، چنانچہ ظہران کی پیٹرولیم یونیورسٹی میں جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین ماہرین فن کو یکجا کرنے کی سعی کی جاتی ہے ان کا بحیثیت پروفیسر تقرر ہوا اور وہاں انہوں نے برسوں نہایت خوبی سے تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے، چند برس قبل جب دہلی میں ہمدرد یونیورسٹی کی شکل میں محترم جناب حکیم عبدالحمید دہلوی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو حکیم صاحب کی جوہر شناس نگاہ ان پر پڑی اور وہ اس جامعہ کی وائس چانسلری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

اور اپنی جانکاہی، جگر سوزی، خاموش خدمت اور مسلسل جد و عمل سے نہایت قلیل مدت ہی میں بڑی نیک نامی حاصل کی، اپنی مادر علمی مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ مقاصد سے ہمیشہ خاص ربط و تعلق رکھا اور جب بھی اس پر کوئی آنچ آئی تو وہ سینہ سپر ہوگئے، ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کی وجہ سے جب اس کے بنیادی کردار کو ختم کرنے کی سازش کی گئی تو انھوں نے نہایت وقار و پامردی سے اس کی مخالفت کی پاداش میں وہ زیر عتاب بھی آئے، لیکن بالآخر کامیاب و کامران ہوئے، دوسرے معاملات میں بھی ان کا یہی حال تھا، انہوں نے ذاتی مفاد و حصول منفعت کیلئے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو قربان کرنا کبھی پسند نہیں کیا مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے وہ برابر سرگرم عمل رہتے تھے اور اس سلسلہ میں ہر تعلیمی و علمی ادارہ کے متعلق باخبر اور فکر مند رہتے تھے۔

دار المصنفین کے قدر داں تھے، اس ادارہ سے جناب حکیم عبدالحمید کے دیرینہ تعلق اور اس کے مسائل سے ان کے شغف کی وجہ سے بھی وہ یہاں کے ذمہ داروں سے نہایت خلوص و محبت سے پیش آتے، ایک مرتبہ اس کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے تو بہت مسرور ہوئے۔

بڑے عہدوں پر فائز ہونے، بین الاقوامی شہرت کے حامل ہونے اور بے شمار علمی اعزازات پانے کے باوجود وہ علمی پندار اور احساس تفوق میں مبتلا نہ ہوئے، ان کے حسن اخلاق، جذبۂ ایثار و ہمدردی اور پاکیزہ نفسی کا تاثر ہی دلوں پر قائم ہوتا رہا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انکے نیک اعمال کو قبول فرمائیں اور اپنے جوار رحمت کی نعمت سے سرفراز فرمائیں۔

"ع۔ص"

ادبیات

بہ یاد ۶ دسامبر ۱۹۹۲ء

از ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی علی گڑھ

بام و در ریختہ شد، گنبد و دیوار شکست — آہ کز منزل الفت ہمہ آثار شکست

آسماں بوس منارات صفا و عرفان — تیرہ دل دستہ ای شیطان جفاکار شکست

پانصد سالہ بنائی کہ ز بس محکم بود — ساعتی چند نہ رفتہ کہ بیکبار شکست

صانع ہر دو جہاں، سالزدہ دور زماں — بین کہ آن قصر محبت بچہ ہنجار شکست

سنۂ سیزدہم در سدۂ پانزدہم — اعتبار مہ و خورشید ضیابار شکست

(۱۴۱۳ھ ـ ۱۰ ؍ جمادی الثانیہ)

غزل

از جناب محمد انعام اللہ صبا بمبئی

کسی کی رہگذر ہے اور میں ہوں — مرا ذوق سفر ہے اور میں ہوں

نہیں کچھ اعتبار شوق پھر بھی — یہی رخت سفر ہے اور میں ہوں

میں اک ذرہ ہوں اس صحرا میں لیکن — شعور دیدہ ور ہے اور میں ہوں

نگاہ لطف ہے کیا سحر آگیں — کہ ہر شے معتبر ہے اور میں ہوں

صبا یہ کون سا عالم ہے جس میں
فغاں بے اثر ہے اور میں ہوں

مطبوعات جدیدہ

صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات از جناب مولانا سید جلال الدین عمری، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۸۸، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ یوپی ۲۰۲۰۰۱۔

انسان کی روح و قلب کی طرح اس کے بدن کی تندرستی اور جسمانی بیماریوں کے لیے بھی قرآن و حدیث میں نسخہ شفا موجود ہے، خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیمات میں ایسے اصول بکثرت ملتے ہیں جن کی بنیاد پر علم طب کی عمارت قائم ہے، اسلام کے دوسرے احسانات کی طرح موجودہ دور میں طب جدید نے اس کے اس احسان کے اعتراف میں بھی بخل سے کام لیا ہے، زیر نظر کتاب میں فاضل مصنف نے اسی جذبہ سے ان صحت بخش تعلیمات کی ضرورت و افادیت کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق نہایت دلکش اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے، انہوں نے فضائی آلودگی، منشیات کی کثرت اور ذہنی اضطراب جیسے مسائل کا جائزہ لے کر طہارت و غذا وغیرہ کی اہمیت بیان کی ہے، اس سلسلہ میں ایک باب میں مرض و علاج کی شرعی حیثیت اور حلال و حرام کے فرق کا بھی جائزہ لیا ہے، خودکشی کی ممانعت اور مریض کے قطع حیات جیسے مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے، ایک بحث میں انہوں نے محرمات کے ذریعہ علاج کے متعلق مختلف مکاتب فقہ کے خیالات

کو بھی پیش کر دیا ہے، روحانی علاج پر بھی مختصر بحث کی گئی ہے، اس طرح اس مفید کتاب میں طب اسلامی کا مکمل و جامع احاطہ کر لیا گیا ہے، مصنف کا اسلوب دل میں اتر جانے والا ہے اور یہ اس کتاب کی نمایاں خوبی ہے وہ حکیمانہ انداز میں اہم نکتے بیان کرتے جاتے ہیں مثلاً ایک جگہ سرمایہ دارانہ نظام کی نفسیات کو یہ لکھ کر واضح کیا کہ "ایڈز کی تحقیق و علاج میں جو رقم صرف ہو رہی ہے اس کا دسواں حصہ بھی ملیریا یا کالا آزار جیسی بیماریوں کے ختم کرنے پر صرف نہیں ہوتا، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایڈز اونچے طبقہ کی بیماری ہے اور ملیریا میں عام لوگ گرفتار ہوتے ہیں"۔ ایک جگہ لکھا کہ "تیمم سے طہارت نہیں حاصل ہوتی البتہ طہارت کا تصور زندہ رہتا ہے"۔ کتابت و طباعت کا معیار اعلیٰ درجہ کا ہے البتہ ص ۲۵ پر ایک عبارت میں 'مغرب' کا لفظ دوبارہ آیا ہے اس میں پہلا لفظ مشرق ہونا چاہیے۔

سرسیدؒ کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے از جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہترین، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۷، قیمت ۱۷۵ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

زیر نظر کتاب فاضل مولف کے ان چند مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جن کو وقتاً فوقتاً سرسید احمد خاں کے تعلق سے انہوں نے سپرد قلم کیا تھا، ان میں بعض مضامین سرسید کے نامور رفقاء مولانا حالی، نواب وقار الملک، شیخ عبداللہ اور مولوی فرید احمد مارہروی سے متعلق ہیں، لیکن زیادہ تر تحریروں کا موضوع سرسید

کی مفکرانہ اور مصلحانہ شان اور ان کے مقام بلند کی تعیین ہے، فاضل مولف نے ایک صاحب نظر مورخ کی حیثیت سے سرسید کے عہد اور ماحول کا جائزہ لے کر ان کی سیرت و شخصیت کے تابناک پہلوؤں کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ سرسید کے فکر و نظر کی بعض ناہمواریاں ان کی روح و جذبہ کی پاکی اور سچائی کے سامنے بے عیب نظر آتی ہیں، فاضل مولف کا خیال ہے کہ سرسید کی فکر کو محض ان کی تعلیمی جدوجہد یا ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل یا یہاں کے مخصوص سیاسی حالات کے پس منظر میں دیکھنا، بنیادی طور پر ایک غلط کوشش ہے، بلکہ ان کی فکر وسعی کو سمجھنے کے لیے اس زمانہ کے اور ایشیائی ممالک اور عالم اسلام کا پس منظر بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کی بہتری میں ہندوستان کی بہتری اور اس کی بہتری میں ایشیا کی بہتری دیکھتے تھے، سرسید کی مذہبی فکر کی بنیاد عقلیت، تطبیق اور اجتہاد پر تھی، اس سلسلہ میں جمال الدین افغانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و خیالات اور سرسید کے اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، ایک جگہ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "خطبات احمدیہ دور جدید میں اسلامی فکر کا ایک سنگ میل ہے اور ان کی تفسیر قرآن کو معرکہ سائنس و مذہب کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے، سرسید کی تفسیر کے متعلق یہ بھی لکھا کہ "سرسید اور مولانا آزاد نے جس طرح اپنی تفسیروں کو اٹھا لیے اس کا آخر تک نبھانا آسان نہیں تھا، ان دونوں تفسیروں کا نامکمل رہ جانا کوئی اتفاقی امر نہیں اس کے پیچھے فکری ماحول اور تحقیقی قدروں اور پیمانوں کی تبدیلی تھی"۔ اس اجمال کی اگر وضاحت کر دی جاتی تو یہ بحث زیادہ دلچسپ اور فکر انگیز ہو سکتی تھی البتہ انھوں نے یہ بجا طور پر لکھا کہ "سرسید کے طرز فکر نے ہندوستانی مفسروں کو

قرآن کی ایسی تفسیروں کی جانب متوجہ کردیا جو وقت اور حالات کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں" فاضل مولف نے ایک جگہ یہ اعتراف کیا کہ سرسید کی فکر جس کی توانائی، افادیت اور مقصدیت اپنی جگہ مسلم تھی صدا الصحرا بن گئی، لیکن ان کے خیال میں سرسید کی سیرت کے تمام پہلو اگر کسی قالب میں پھر جمع ہو جائیں تو یہ فکر آج بھی اسی درجہ موثر ثابت ہوسکتی ہے، یہ کتاب متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اس لیے بعض خیالات کی تکرار ظاہر ہے، لیکن بعض مضامین میں عبارتیں تک یکساں ہیں۔

فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں) از جناب پروفیسر

وحیدالدین، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۱۴۸ قیمت ۳۰ روپے؛ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

علامہ اقبال کی شاعری ہی ان کے فکر و فلسفہ کی حقیقی ترجمان ہے، لیکن انکے مشہور خطبات مدراس میں ان کے فلسفیانہ خیالات زیادہ دقیق و عمیق اور ایک مربوط شکل میں ظاہر ہوئے ہیں، اور زیر نظر کتاب کے فاضل مولف جو خود اچھے فلسفی ہیں کی نگاہ میں ان خطبات میں اسلامی الٰہیات کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ ارباب فکر و نظر کے لیے یہ خطبات ابتک موضوع بحث بنے ہوئے ہیں؛ فلسفہ اقبال کے طالب علموں کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے، لیکن اسلوب بحث کی دقت کی وجہ سے ان سے استفادہ آسان نہیں، اسی مقصد کے پیش نظر فاضل فلسفی مولف نے ان خطبات کی تلخیص و توضیح زیر نظر کتاب میں بڑی خوبی سے کی ہے، اس کے علاوہ فکر اقبال کا ابہام کے عنوان سے خود انکا ایک نہایت عمدہ مقالہ بھی اس میں شامل ہے اور تشریح مزید کی صورت میں تین

ضمیمے بھی ہیں، جن سے خطبات کے بعض مصطلحات اور اشخاص کو سمجھنے میں آسانی ہوگئی ہے، شروع میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے قلم سے ایک مختصر تعارفی تحریر بھی ہے، اس میں ان کا یہ خیال محل غور و نظر ہے کہ "اقبال کو غالباً بالکل اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کا انگریزی داں طبقہ ذہنی سہل پسندی میں قدیم فکر والوں سے کہیں آگے تھا، اسے اسلام سے زیادہ تر جذباتی تعلق تھا، ذہنی و فکری سطح پر مجموعی اعتبار سے وہ طبقہ علماء کو ہی اپنا پیشوا سمجھتا تھا اور یہی صورتحال اب بھی ہے"۔

قوام العقائد مترجم جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی، متوسط تقطیع

عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۱۳۱، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: ادارہ نشر و اشاعت، جامع العلوم فرقانیہ، مسٹن گنج، رامپور، یوپی ۲۴۴۹۰۱

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ایک مرید و خلیفہ شمس العارفین حضرت قوام الدینؒ نے امیر حسن سجزیؒ دہلوی کے مانند اپنے پیر و مرشد کے واقعات و حالات کی روایت کی جن کو ان کے پوتے محمد جمال قوام نے ان کی زندگی ہی میں قلم بند کرلیا تھا جو اہمیت میں فوائد الفواد سے کم نہیں لیکن تعجب ہے کہ یہ نہایت بیش قیمت مجموعۂ روایات اب تک پردہ خفا میں رہا اور حضرت محبوب الٰہی کے تذکرہ نگاروں کی رسائی اس تک نہیں ہو پائی، اب جناب نثار احمد فاروقی کو اس کا ایک نادر قلمی نسخہ دستیاب ہوا تو انہوں نے تصحیح و تحشیہ کے بعد اسے اصل فارسی زبان میں شایع کردیا، یہ کتاب انہی کے قلم سے اسی کا ترجمہ ہے، جو پہلے رام پور کے ماہنامہ ضیاء وجیہہ کے خاص شمارہ کی شکل میں شایع کیا گیا اور اب اسی ادارہ نے عام فائدہ کے لیے کتابی صورت میں شایع کردیا ہے، ترجمہ کی خوبی کے لیے فاضل مترجم کا نام ہی

پوری ضمانت ہے، ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی ان کی ژرف نگاہی اور رعنائی بیان کا نمونہ ہے جس سے اس نسخہ کی تاریخی اہمیت، راوی کی شخصیت اور مشمولات کی امتیازی خصوصیات کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔

نظام رنگ از جناب ڈاکٹر اسلم فرخی، متوسط تقطیع اور عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۷، قیمت ۳۰ روپے پتہ: احسن مطبوعات، ب۔ ۱۵۵/۵ گلشن اقبال، کراچی، پاکستان۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سوانح پر مشتمل یہ ایک ادبی خاکہ ہے اور چونکہ صاحب سوانح کی ذات بابرکات، لائق مولف کی فکر ونظر اور محبت وعقیدت کا محور ہے اس لیے اس میں تاثیر اور دلکشی کی تمام خوبیاں ہیں اور طرز واسلوب کی جدت اس پر مستزاد ہے، بڑی بات یہ ہے کہ اس میں کرامتوں اور تصرفات روحانی کا سہارا نہیں لیا گیا بلکہ سلطان المشائخ کے مکارم اخلاق، پاکیزہ اعمال اور معاشرتی اصلاح کے پُرخلوص جذبہ کو اس خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے کہ یہ خاکہ شنیدہ مانند دیدہ کی کیفیتوں سے معمور ہوگیا ہے، مصنف کی یہ انوکھی ادا داد کے لائق ہے۔

رنگ وآب از جناب سید محمود حسن قیصر امروہوی متوسط تقطیع کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ مجلد مع گرد پوش صفحات ۲۰۰، قیمت ۸۵ روپے پتہ: سید محمود حسن قیصر امروہوی ۲۲/۴ زہرا باغ علی گڑھ

جناب سید محمود حسن قیصر امروہہ کی قابل احترام علمی و ادبی روایات کے وارث وامین ہیں، انکی کئی کتابیں اردو اور انگریزی میں طبع ہوئی ہیں اور انکی تحریریں معارف کے علاوہ ملک کے دیگر مجلوں کی زینت بنتی رہی ہیں، زیر نظر مجموعہ کلام انکے شعری کمالات کا آئینہ ہے اس میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ دیگر اصناف سخن جیسے قطعات، قصائد، مراثی، مناقب، دوہرے وغیرہ بھی شامل ہیں اور ان سے شاعر کی قادر الکلامی اور مشاقی صاف نمایاں ہے، خصوصاً حصہ نظم زیادہ جاذب اور پُراثر ہے۔

ع ۔ ص۔